عقبہ دروازہ
حمید سہروردی

عقب کا دروازہ

مُصنّف کی دوسری کتابیں

١- ریت ریت لفظ ١٩٨٥ء مہاراشٹر اور یو۔پی اردو اکاڈیمیوں سے انعام یافتہ افسانوں کا مجموعہ

٢- بکھرے ہوئے دن (زیر ترتیب)

٣- ششش جہت آگ (نظمیں) (زیر ترتیب)

۴- بین السطور (مضامین) (زیر ترتیب)

:- ملنے کے پتے :-

١- ادارہ شعر و حکمت، ٨٦٥-٦-١١، ریڈ ہلز حیدرآباد ٥٠٠٠٠۴

٢- اردو رائٹرس گلڈ، لٹریری بک سنٹر ١٢٦- چوک شیو چرن لعل روڈ- الہ آباد ٢١١٠٠٣

٣- مکتبۂ رفاہ عام، نزد درگاہ خواجہ بندہ نوازؒ گلبرگہ ٥٨٥١٠٢

۴- نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن - ٢٧٥١٠١

رابطہ: حمید سہروردی صدر شعبۂ اردو شری بنتی کے۔ ایس۔ کے عرف کاکو کالج بیڑ- ۴٣١١٢٢ (مہاراشٹر)

عقب کا دروازہ

حمید سہروردی

:تقسیم کار:
نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ

اشاعت ۱۹۸۷
تعداد .. .. .. چھ سو
ناشر .. .. .. مصنف
طابع .. .. .. نظامی پریس
کتابت .. .. .. علی احمد داتش
سرورق .. .. .. جینت پرمار

قیمت

۳۰ — روپے

قسیم کار

نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ ۳

انتساب

والدین : محمد محمود علی سہروردی — اور
سلیمہ بی سہروردی

بھائی : محمد احمد علی سہروردی، محمد عبدالرحیم سہروردی
محمد عبدالمجید سہروردی، محمد احمد شریف سہروردی

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی

حکومت اترپردیش (لکھنؤ) کے

مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے

فہرست

پیش لفظ

افسانہ حمید سہروردی کے لیے ایک ایسا میڈیم ہے جس کے ذریعہ وہ ذات، اور ذات کے وسیلے سے کائنات کی دریافت کرتا ہے۔ ذات کی شناخت و دریافت حمید سہروردی ہی کا نہیں بلکہ اس کی ہمعصر نسل کا بنیادی مسئلہ ہے۔ عصری آگہی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا تخلیقی کرب ہر دور میں اچھے فنکار کی میراث رہا ہے۔ اس تخلیقی کرب کے مختلف اظہار ہمیں جوگندر پال کی داخلی خود کلامی، بلراج مین را کے استعاراتی نظام، سریندر پرکاش کی فضا سازی میں ملتے ہیں۔ حمید سہروردی اور اس کی نسل کا کرب ویسے بھی دہرا ہے۔ ایک باشعور اور باخبر فنکار ہونے کے ناطے اسے اچھی طرح علم ہے کہ افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں اس کی انفرادی شناخت کا استحکام اس بات پر مبنی

ہے کہ وہ افسانوی روایت کی توسیع کرے۔ دوسرے اسے اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ اردو افسانہ دوسری اور زبانوں کے مقابلے میں اپنی شناخت کھو رہا ہے لہٰذا اسے ایک نئی جہت سے روشناس کرانا ہے۔

اسی لئے "دیت دیت لفظ" کے خالق حمید سہروردی نے اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا اس مرحلہ سے نہیں کی جہاں اس کے پیش رؤں نے افسانے سے ہاتھ چھڑا کر بردیگنڈے کا دامن تھاما تھا۔ داستان و تمثیل کی طرف حمید سہروردی کی مراجعت ایک شعوری اور تشکیلی عمل ہے۔ وہ روایت سے ربط رکھتے ہوئے نئی فنی قدروں کی دریافت کے عمل کا قائل ہے۔

موجودہ معاشرے کو حمید سہروردی کنفیوزڈ، غیر مربوط، منتشر اور زوال پذیر قرار دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ افسانے کے عصر حاضر میں گم ہو جانے کا شدید احساس فنی روپ دھارن کر لیتا ہے، مثلاً وہ ایک کہانی، میں کہانی کا گم ہو جانا گویا حمید سہروردی کے لیے ذات کے گم ہو جانے کے مترادف ہے اور اسی لیے کہانی کی دریافت ہے کیونکہ "سب سے بڑی کہانی وہ ہے۔ 'وہ'۔۔ جو ہمارے تمہارے اندر مسلسل جی رہی ہے۔"

حمید سہروردی کے افسانے موضوع کے اعتبار سے بے ربط، مقصد کے اعتبار سے بے جہت اور کردار نگاری کے اعتبار سے بظاہر کنفیوژن کا شکار نظر آتے ہیں اور ایک عام قاری ان کے افسانے پڑھنے اور سمجھنے میں قدرے دشواری محسوس کرتا ہے۔ اس دشواری کی بنیادی وجہ ادبی ذوق کا ضعف یا جہالت نہیں بلکہ تاریخی تناظر سے لاعلمی ہے۔ جس طرح سے ادبی مذاق اور حسیت کی تربیت کی جانی چاہیے تھی، نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۹۵۰ء اور سنہ ۱۹۷۰ء کے درمیان کی نسلوں

میں ہیئت کا ایک زبردست خلاء نظر آتا ہے۔ فرائیڈ، مارکس، ایلیٹ اور جوائس وغیرہ نے اردو پر بھی دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ اردو کی ایسی تخلیق پر زور دیا جانے لگا جو بین الاقوامی لسانی قدروں کے معیار پر پوری اُترے لہٰذا حقیقت نگاری، ترقی پسندی، علامت پرستی وغیرہ جیسے رجحان ادب میں در آئے اور اردو ادیب کو پہلی مرتبہ اس بات کا شدید احساس ہوا کہ زبان اور تجربہ کے درمیان ایک حد فاصل ہوتی ہے جسے محض ایک نئے اسلوب، ایک نئے ڈکشن کے ذریعہ ہی پاٹا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد اردو افسانے میں خصوصاً ایک ایسا اسلوب اور ڈکشن تخلیق ہوتا ہے جو زبان کے مقبول عام معیار کی نفی کرتا ہے۔ حمید سہروردی کے افسانوں کا ڈکشن باغیانہ اور اسلوب جارحانہ ہوتا ہے۔ اس کے اسلوب کا بنیادی وصف بولی یا dialect کا بے ساختہ تصرف ہے۔ جملوں کی ساخت، مکالموں کا تسلسل، خیال کی روانی، کمال چابکدستی سے توڑ دیئے جانے میں جیسے عام بول چال میں ہوتا ہے۔ زبان کا خلاقانہ برتاؤ دراصل لفظ و معنی، ترسیل و ابلاغ کی باہمی کشمکش سے نمو پذیر ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے حمید سہروردی کے فن میں تخلیقی تناؤ CREATIVE (TENSION) برقرار رہتا ہے۔

حمید سہروردی زندگی کو مختلف الابعاد DIMENSIONS میں دیکھنے اور برتنے کا قائل ہے۔ اس کے افسانے نہ ہی روایتی انداز کی کہانی کے پابند ہوتے ہیں اور نہ ہی پلاٹ کے۔ اس کے پاس کردار نگاری کا کوئی زاویہ متعین نہیں اور نہ ہی زماں و مکاں محدود ہیں۔ موضوع کی جبریت کبھی اس کے افسانوں پر حاوی نظر نہیں آتی۔ زندگی کی ہر واردات

اس کے لیے ایک کہانی بن رکھتی ہے لہٰذا اس کے کردار بیک وقت شعوری ولاشعوری، داخلی وخارجی، طبعی ومابعد الطبیعی سطحوں پر جیتے ہیں اور یہ سطحیں غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے انقطاع وانضمام کے عمل سے گزرتی رہتی ہیں۔ بظاہر بے ربطگی، بے رشتگی، لاتعلقی، بے جہتی، بے زمینی وغیرہ جیسے موضوعات اپنی داخلی دروبست میں ذات کے تخلیقی تواتر وتوسیعی ارتقار کے عمل سے جلا پاتے ہیں اور انھیں کی وجہ سے حمید سہروردی کی کہانیوں میں معنی ووژن اسلوب کے وسیلہ سے باہم متصل ہوجاتے ہیں۔

ڈاکٹر ارتکاز افضل
شعبۂ انگریزی
مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد

وہ ایک کہانی

ایک صاف کاغذ لو، ایک ایسا پن لو جس میں سیاہی کے آخری قطرے جی رہے ہوں۔ لکھو ایک کہانی، کچھ نہ کچھ لکھو، جو تم لکھنا چاہتے ہو، کچھ اس طرح لکھو کہ تمھاری کہانی ہم سب کی کہانی بن جائے۔ کہانی تمھاری ہماری سبھی کی ایک ہی ہے۔ ہم بظاہر علاحدہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اپنے وجود کے اندر ایک کہانی رکھتے ہیں۔ تو یوں ہی ایک بات جو سب سے پہلے ہوئی تھی۔ جب ہم میں سے کوئی نہیں تھا۔ صرف کہانی تھی، کہانی کیا سچی ہوتی ہے، تو کیوں وہ ہمارے وجود سے پہلے ہی سے جی رہی ہے، ہم ایک مرتبہ ایک درخت کے نیچے سوچ رہے تھے، کیا وہ بھی کہانی ہے، وہ کہانی کو کسی ہے، سناؤ، سناؤ کیا سناتے ہوئے بھی ڈراتے ہو، اکیلے کمرے میں ہوں یا پہاڑ کی بلندی پر کھڑے ہو کر، لیکن کہانی سناؤ۔ تمھیں کچھ سنانا ہے، دیکھتے نہیں ہو، روزانہ کتنی کہانیاں ہم سناتے ہیں، کہانی سناؤ یا لکھو، کاغذ تمھارے ہاتھ میں تھما دیا گیا ہے، تمھیں کہانی لکھنا ہی ہوگی، کیا تم کبھی اس درخت کے نیچے خود کو نہیں لے گئے ہو، جہاں روشنی ملتی ہے، کہاں ہے، وہ درخت تمھیں معلوم ہے، نہیں

معلوم ہو تو تم اس جہاں میں کیا کرتے ہو، کیا نہیں کرتے، کبھی کچھ تو کرتے ہیں، چلو، اپنی کہانی سناؤ، کہانی وہی ہے، جو ہم سب کے درمیان ہے۔ عجیب بات ہے، کہانی تو ہمارے درمیان ہوتی ہے، سناؤ۔ سناؤ، اپنی کہانی سناؤ ــــ

کہانی

ایک درخت تھا، درخت کے نیچے ایک آدمی خاموش بیٹھا تھا، ایک لمبی کہانی سوچ رہا تھا، کہانی سوچ رہا تھا یا کچھ لفظوں کا ذخیرہ، پھر کہانی کس کو کہتے ہیں، وہی ہے نا، لفظوں کی کہانی یا گونگی کہانی، چہروں کی زبانی لفظوں کی کہانی، کاغذ پر بکھری ہوئی کہانی ہوتی ہے نا، تو سنو، ایک بے حد لمبی کہانی، کہانی سناؤں۔

ایک غار تھا، غار میں گھپ اندھیرا تھا، اندھیرے میں کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ شاید وہاں سانپ بھی تھا، اندھیرا ہی اندھیرا۔ کہانی میں بہت سے کردار بھی تھے، آدم، ایک کہانی کا مرکزی کردار ہے، آدم کی کروٹیں، پتھر کا درد، اور آدم کی رسائی، بہت سے آدمیوں میں، کہانی کیا سناؤں۔

ایک کہانی سقراط کی ہے۔ کہانی لکھتا نہیں تھا، سناتا تھا، آخر اس نے زہر پی لیا، کہانی ایک نئی پیدا ہوئی۔

تمہیں کہانی سننے کی فرصت ہے، اب جبکہ ہم اپنے وجود کے اندر ایک نامعلوم مانع کی حالت کو محسوس کر رہے ہیں، ہم سب وہاں ہیں، جہاں ہمارا وجود نہیں پہنچ سکتا، پہاڑ پر بھی نہیں، پہاڑ پر چڑھائی تو ہو چکی ہے، پہاڑوں اور غاروں کو تراش کر پتھروں پر کہانیاں محفوظ کر دی گئیں۔

کہانی مختلف روپ بدل چکی ہے، ہم سب نے دیکھا ہے، نہیں، نہیں وہ کہانی بےتجربے خاتون، بجربہ خاتون کی وہاں ہے، آسمان ہیں، چاند کے اندر، چاند کی کہانی بہت مرتبہ سُن چکے ہیں۔ اب جاکر پڑھ لینا ہے۔ لیکن وہ کہانی جو تم سنانا چاہتے تھے کہاں ہے۔

تو کیا میں نے کہانی نہیں سنائی ــــ

نہیں ــــ

ہاں تو ایک مرتبہ، ایک آدمی دنیا میں آیا، اور ہم نے پڑھا، وہ "آدم، نہیں، آدم کے وجود سے کہانی نہیں بنتی، کہانی تو سمندر کے جھاگ سے بنتی ہے، دیوانے کہیں کے، کہانی وہاں سے کیسے شروع ہوئی، میں سناؤں گا، تمھیں ایک کہانی، میں نے وعدہ بھی کیا ہے، وہ کہانی، وہ سب سے لمبی اور بڑی کہانی

کہانی سناؤں ؟

ہاں تو کچھ یوں ہوا، طوفانی ہوائیں، درختوں کے پتّے جھڑ رہے ہیں، غار روشنی سے منوّر ہو رہے ہیں۔

جلدی کہانی سناؤ، ہم مرجائیں گے، ہم مرجائیں گے، ہم مرجائیں گے، پھر ایک کہانی بنے گی۔

تو سنو : پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا، ہجرت کا مسئلہ پیش آیا، پہاڑوں پر جاکر بیٹھا گیا، درخت کے نیچے مسلسل غموں کو سمجھا گیا ــــ

تم بکواس کر رہے ہو، کہانی سناؤ ــــ

کیا تم سب تیار ہو، دیکھو سنبھل کے بیٹھ جاؤ، ایک کہانی، دنیا کی بڑی کہانی، آج، دنیا کی سب سے بڑی کہانی "میری طرف دیکھو" کیا دیکھ رہے ہو، دنیا کی سب سے بڑی کہانی!

ــــ ــــ

لفظوں کی خواہش

کچھ دنوں سے لفظ ہی گم ہوتے جا رہے ہیں۔
لفظوں کا ذخیرہ میری دانست میں ایک مجموعی ورثہ ہے۔ صبح اور شام کتنے ہی الفاظ کسی پروگرام کے بغیر زبان اُگل دیتی ہے۔ ایک لفظ کا وجود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک کہانی بنا سکتا ہے لیکن کچھ ایسا ہی روزانہ محسوس ہونے لگا ہے کہ ان لفظوں کے ساتھ ساتھ میں بھی پگھلتا جا رہا ہوں۔ میں غور کرنے لگتا ہوں۔ اپنی ہی ذات پر کہ ایسا کیوں ہونے لگا ہے۔ میری ذات دور دور تک اس کا جواب نہیں رکھتی۔ ایسا لگتا ہے کہ لفظوں ہی سے میری ذات انکار کرنا چاہتی ہے۔
میں اپنے کمرے میں بیٹھا، ایک پروگرام مرتب کر رہا ہوں۔ کھوئے ہوئے الفاظ کو پھر سے حاصل کر لوں۔ حاصل کرنے کے لیے ایک پروگرام کا ہونا ضروری ہے ــ ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ میں نے لفظوں سے ایک بھرپور داستان لکھ ڈالی، اور اس داستان میں صرف لفظ کے ہونے کا احساس تھا۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں اُن الفاظ کی مدد سے اپنی کہانی لکھنا چاہتا ہوں جو بنی نوع انسان کے لیے کارآمد ثابت ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ الفاظ میرا

ساتھ نہیں دیتے۔ میں سوچتا ہوں۔ اگر الفاظ ہی نہ ہوں تو اس بڑے کارخانے کا کام کیسے چلے گا۔

اب میں بھول جاتا ہوں کہ لفظ ہی نہیں ہے۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ وہ دراصل ہمارا جذبہ ہے، ہمارا احساس، ہماری فکر ہے۔ لفظوں کی مدد سے ہم اپنے وجود میں پگھلتے ہوئے احساس کو اگل دیتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ کچھ الفاظ منتخب کر لوں، جو ان جذبات، احساسات اور تفکرات ہی کو لکھیں۔ جو میرے پگھلتے ہوئے وجود کو سنبھال سکیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ، میں ان لفظوں سے چھٹکارا حاصل کر لوں تو میری عقل اس بات کو قبول ہی نہیں کرتی کہ بغیر لفظوں کے کبھی ہم جی سکتے ہیں۔

پھر ایک خیال آتا ہے کہ ہم نے اپنے اپنے نزدیک کچھ فارمولے بنا لیے ہیں کہ ہم لفظوں سے ہی کام لیں گے اور یہی فارمولے ہماری توانائی کو ختم کرتے ہیں۔

میری سوچیں پھیلتی جا رہی ہیں اور ان سوچوں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ بارہا اس دوران اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ میں بیکار ہوتا جا رہا ہوں۔ پھر اس طرح سوچ کر الفاظ نہ ہوتے تو ہمارے جذبات، احساسات اور تفکرات کس طرح ایک دوسرے کے سامنے ظہور پذیر ہوتے۔ ایک مسئلہ ہے، جو آہستہ آہستہ الجھتا جا رہا ہے۔

رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی ہے۔ دور دور تک سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ایک گمان کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اندھیری رات میں، میں اکیلا جاگ رہا ہوں۔ میرے کمرے میں میرے دونوں دوست نجانے کیا سوچتے سو گئے ہیں۔ یوں ہی سوچ لیا ہوگا کہ صبح اٹھ کر یونیورسٹی جانا ہوگا۔

اور وہاں لفظوں کے ذریعہ ہی انھیں تفکرات، جذبات اور احساسات کو سمجھ لینا ہے۔ دونوں دوست آرام سے سوئے ہوئے ہیں۔ میں کبھی پلنگ پر لیٹتا ہوں، اور کبھی کرسی پر بیٹھ کر لکھنا چاہتا ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں۔ میری نیند بھی نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ سگریٹ پر سگریٹ پیتا جا رہا ہوں۔ لیکن کیوں۔ ایسا کر رہا ہوں، خود مجھے اپنی حرکتوں پر قابو نہیں ہے۔ اور دماغ، اپنی حرکتوں کو سمجھنے سے معذور ہے۔ میں کرسی سے اٹھتا ہوں۔ دونوں دوست سو رہے ہیں۔ کمرے میں لائٹ جل رہی ہے۔ سوچنے لگتا ہوں کہ کاش مجھے بھی ان دونوں کی طرح نیند آجائے۔ نیند۔ نیند۔ چیخنے لگتا ہوں۔ باری باری دونوں کو اٹھاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ان دونوں سے باتیں کر لوں۔ اور لفظ کیا ہے۔ انھیں آواز دیتا ہوں ...... دونوں آرام سے سوئے ہوئے ہیں۔ گہری نیند — لفظوں سے دور — کیا یہ صبح اٹھ کر یونیورسٹی میں لفظوں کے بغیر اپنی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں؟ کیا میں رات بھر جاگ کر لفظوں کو حاصل کر سکتا ہوں۔ لفظ — گمشدہ لفظ —"

پھر پلنگ پر آکر لیٹتا ہوں۔ روشنی کی وجہ سے چڑیاں بھی چیں چیں کر رہی ہیں، چڑیوں کو کمرے سے باہر کرنا چاہتا ہوں اس چیں چیں میں بھی کیا کوئی مطلب و مفہوم چھپا ہوا ہے۔ کیا ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔ کتنے ہی لفظ ہوں گے۔ جن سے کاغذ کے البم سیاہ ہو چکے ہوں گے۔ آج تک لفظوں نے کیا کیا ہے۔ کیا لفظوں سے وہ تمام باتیں حاصل ہو چکی ہیں جو روز بروز ژولیدگی کا شکار ہوتی جا رہی ہیں؟ آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگی ہیں۔ کچھ دیر یوں ہی آرام کر لیتا ہوں۔ گو کہ آنکھیں

بند ہیں، لیکن مجھے اس پر اطمینان نہیں ہے کہ میں سو گیا ہوں ۔
دور بہت دور کہیں سے اذان کی آواز آ رہی ہے ۔ لفظ ۔ لفظ ۔ لفظ ۔ کیا کیا جائے .... میں سوچتا ہوں کہ وہ الفاظ کہاں گئے ہیں جنھیں میں ڈھونڈ رہا ہوں ۔ میں پھر پلنگ سے اُٹھتا ہوں ۔ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا ہوں ۔ زبان ایک بھی لفظ ادا نہیں کر رہی ہے ۔ خود پر گونگے ہونے کا گمان غالب ہوتا جا رہا ہے ۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے ۔ میں جھلا کر اٹھتا ہوں ۔ میں کس سے کہوں ۔ میرے دونوں دوست سوئے ہوئے ہیں ۔ نہیں یہ بھی میری مدد نہیں کر سکتے ۔
میری زبان آہستہ آہستہ ہکلا رہی ہے ۔ مگر کچھ کہہ نہیں پا رہی ہے ۔ آس پاس سے وہی آواز سنائی دینے والے لفظوں کی آ رہی ہے ۔ بچے روتے ہوئے اُٹھتے ہیں ۔ انھیں لفظوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ میرے کمرے کے بازو ایک بچہ بہت میٹھے لفظ ادا کرتا ہے ۔ لیکن اس بچہ کی آواز نہیں آتی ہے ۔ میں کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہوں ۔ مجھے خیال آتا ہے وہ گونگا قصائی اپنے گاہکوں کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہوگا ۔ کیسے وہ لفظوں کو ادا کرتا ہوگا ۔ وہ قصائی کتنا مجبور ہے، میری زبان پر ایک بھی لفظ نہیں آ رہا ہے ۔ آخر ایسا کیوں ۔
میرے ذہن میں ایک ایسا لفظ گھوم رہا ہے ۔ جس کی معنویت کا عمل میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں ۔ مجھے آہستہ سے خیال آتا ہے کہ میں گونگا نہیں ہوں ۔ کیونکہ کچھ دیر پہلے میں نے اپنے دوستوں کو آواز دی تھی ۔ آخر وہ لفظ کیوں میری زبان پر نہیں آ رہے ہیں ۔ وہ لفظ کیوں ناراض ہیں ۔ انھیں کیا چاہیئے عمل ۔

میرے پاس جو الفاظ محفوظ ہیں، میں انھیں خواہ مخواہ استعمال نہیں کرانا چاہتا۔ اگر یہ بھی ختم ہو گئے تو میرے پاس کیا رہ جائے گا، میں چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں . . . میں زور سے چیخنے لگتا ہوں۔ اور کہتا ہوں کہ "کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا کا ہر شخص، یہ کہہ سکے میں مطمئن ہوں۔"

--

خالی لمحوں کا سفر

اس شخص کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، اس کے چہرے پر سمجھ میں نہ آنے والی ریکھائیں اُبھر رہی ہیں اور پھیلتی جا رہی ہیں۔

اب وہ چلتا ہے، بغیر کسی پروگرام کے ہی، چلتے چلتے اپنے اطراف کی تمام گلیوں کو پار کر لیتا ہے، اور سڑک پر آتا ہے۔ کچھ ثانیہ کے لیے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، پھر سوچتا ہے —— پروگرام کچھ بھی نہیں، کوئی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ خوش ہوتا ہے۔ ایسے میں یہ مناسب نہ تھا کہ کوئی اس کی طرف دیکھے وہ بس خود میں رہنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ کہاں جا رہا ہے؟ چاہتا تو وہ آرام سے سو سکتا تھا۔ چلنا آسان نہیں۔ اور وہ بھی بغیر کسی پروگرام کے۔ اب تفریح کا وقت بھی نہیں ہے۔ کیا اس کا کوئی نہیں ہے —؟

وہ صرف چل رہا ہے، کسی سمت کا تعین کیے بغیر ہی —— کبھی کبھی مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھتا ہے۔ دور دور تک اسے کوئی دیکھنے والا نظر نہیں آتا۔ سنسان سڑک پر چلتے چلتے وہ کہتا ہے۔

"سچائی کا کوئی انت نہیں، کوئی پیمانہ نہیں۔"

ہمارے دور کا دستور بن گیا ہے کہ ہم نمائشی گھر بنائیں، تب کہیں ہم "مسٹر" کہلائے جا سکتے ہیں۔ ویسے ہم بھی کسی زمانے میں روایتی مجبولیت کے نمائندے کہلائے جاتے تھے۔ لیکن کب تک؟ اب بدلنا ہی ہوگا۔ ہم تقلیدی عمل کو تخلیق کا روپ دینے میں ماہر ہیں۔ بہرحال ہم اپنی اپنی انفرادیت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کب تک ایک ہی رنگ میں خود کو رنگتے رہیں...... پاگل۔!

پاگل تو ہر ایک ہے۔ دیکھو نا کہ ناجائز چہروں پر رونق جھلکتی ہے۔ اور.... ٹریجڈی ایک علیحدہ بات ہے۔ جبکہ ریل کا سفر آسان ہے بشرطیکہ پلیٹ فارم پر انتظار نہ کرنا پڑے ورنہ ریل کی پٹریوں پر سارا سفر یوں محسوس ہوگا کہ اپنا ہی خون پٹریوں پر پھیلتا جا رہا ہے اور اس طرح کی ٹریجڈی بیان کرتے ہوئے، اوروں کے چہروں پر مسرت اگ آتی ہے۔ لیکن سچائی کچھ علیحدہ ہی ہوگی۔ جس نے محسوس کیا۔ واقعی وہ اپنے جسم میں خون کی کمی کو محسوس کرتا ہی رہا۔

..... لفظوں کے اعلان میں ایک خاص قسم کی رقابت ہے۔ قدم مسلسل اٹھ رہے تھے۔ ویسے لمحوں نے سازشی نوٹس سفر کے دوران میں ہاتھوں میں تھما دیے تھے۔

..... نیند میں خواب دیکھنا ہمارا پرانا رواج ہے۔ نیند اور خواب۔ نیند بیداری کے لیے ایک کرب ہے۔ لفظوں نے اعلان کیا۔ کچھ عجب ڈھنگ سے۔ ڈھنگ بدلتے تو رہتے ہی ہیں ـــ رنگ اور ڈھنگ

..... ڈھنگ سے رنگ تک پہنچتے پہنچتے ایک مکمل سفر ہو سکتا ہے۔ کچھ اس طرح کی رقابت لفظوں کے اعلان میں تھی۔

معصومیت ——— دہشت میں تبدیل

سادگی ——— پیچیدگی میں ضم

انصاف ——— صرف آسمانوں میں

خلوص ——— محبّت، انس

لفظ اب مسلسل چلتے چلتے تھک گئے - انھیں اب آرام کی ضرورت ہے - آہستہ سے میّت اٹھائی گئی - لیکن ذہن قبر کے عذاب پر پھیلنے لگا - خوف بڑھتا رہا - بڑھتا خوف سفر کو مکمل کرنے میں کہیں کاوٹ نہ بن جائے -

وہ پسینہ پسینہ ہو گیا اور ایک ریت کے ٹیلے پر بیٹھ گیا - ریت کا ٹیلہ ایک ہفتہ کے اندر اندر پھیل جائے گا اور ایک عمارت بنے گی - اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نیند سے پہلے ہی ہم خوابوں کو دعوت دیتے ہیں - اور یہی خواب ہمیں ایک بہت دیر کی میٹھی نیند سلا دیتے ہیں - اس نے ریت کے ٹیلے پر کروٹ بدلی -

آج دوپہر کی دھوپ میں اس نے شدّت سے محسوس کیا کہ جیب کا خالی رہنا، آدمی کی کتنی بڑی ٹریجڈی ہے اور یہی ٹریجڈی پھیلتے پھیلتے عجیب انداز اختیار کر لیتی ہے - جیسا کہ ایسا سوچنا - کیا ہم کو کھوئیں واپس جا سکتے ہیں ؟ اور وہ رو رہا تھا، شہر کی بڑی سڑک پر چلتا ہوا، آسمانوں میں گھورنے لگا - کیا واقعی انسان آسمانوں میں پھنس گیا ہے؟ پورا انصاف - اور پھر یہ کیا ہے ؟

ہم سب ایک گونج کی آواز ہیں، پھر زوال کے لمحوں میں مسرت؟!
جھنجھلاہٹ کے سہمے کہی جانے والی باتوں اور حرارت کا کوئی نوٹس نہیں

لیا جاتا - بلکہ انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے - یہ تعجب کی بات ہے -
بارش اور طوفانی بارش، بوسیدہ چھت، فرش پر آگرتی ہے -
چھت کے ساتھ ہی ایک دو گز لمبا سانپ بھی دھپ سے پھن پھیلائے گرتا
ہے - اور غصہ سے بے قابو ہوتا ہے -

اور ایک دفعہ ایسا بھی ہوا تھا : شراب خانوں میں بے ترتیبی سے
چلنے والی زبان ـــ اور پھر شراب خانوں کے باہر لڑکھڑاتے ہوئے
قدموں پر چلنے والے جملے کسنے والے، سفید چہرے مسلسل جملے کستے ہی رہے -
جن کا کوئی مطلب ہی نہ تھا اور ایسے ہی وقت ایک آدمی شراب کے نشے
میں دُھت زمین پر لوٹتا ہوا، کہنے لگا تھا کہ " اے پاک پروردگار ! مجھے
معاف کر دے - !

اور یہ بھی ایک ٹریجڈی ہی تو تھی، جہر کے گھر شیو ناتھ مر گیا تھا کیا
اسے اپنے گھر کی موت پسند نہیں تھی ؟ سوالات سے کیا ہو سکتا ہے -
موت کا معیّنہ وقت کسے معلوم ؟ لیکن سننے والے اور دیکھنے والے کہتے
ہیں - شیو ناتھ کو اس بے ڈھنگے طریقہ سے مرنا نہیں چاہیے تھا - پاگل
ـــ ڈھنگ اور رنگ لانا ہی فاصلہ رکھتے ہیں - ایسی باتوں پر غور
کرنا منع ہے - میری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں ؟

لیکن جہر کے سینے میں کس نے جھانکا ہے - کیا آنسوؤں کا ہونا ضروری
ہے ؟ پھر کہتے ہیں کہ جہر ہر رات کتنے شیو ناتھ کو موت کا راستہ دکھاتی
ہو گی - چلو تسلیم کر لیا جاتا ہے -

لیکن وہ ہر مرنے والے کے لیے آنسو کہاں سے لائے گی -
وہ کروٹ بدلتا ہے، ریت کو اپنے ہاتھوں میں لیتا ہے اور دوسری

طرف دیکھتا ہے جہاں بارش کی وجہ سے کالی مٹی گیلی ہو گئی تھی۔ وہ ایک دم اٹھتا ہے اور مٹھی بھر ریت گیلی مٹی کی طرف پھینکتا ہے۔ زرخیز مٹی میں ریت پھینکی جائے تا کہ ریت اور مٹی ایک دوسرے کو قبول کر لیں — تو اس سے کیا ہوگا؟ اور کیا یہ ممکن ہے؟ ناممکن کیا ہے؟

وہ پھر پہلے کی طرح لیٹ جاتا ہے۔ میں کیوں لوٹ کے گھر نہیں جاتا؟ میں تو آنسوؤں کا محتاج نہیں ہوں، اوروں کی طرح کیا مجھے اس سے نفرت ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے، میں نے اپنا پورا وقت "ص" کے نام وقف کر دیا ہے — پاگل — واقعی پاگل —

اور وہ دن بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب گھومتے گھومتے بے مقصد ہی ریلوے پلیٹ فارم پر پہنچا تھا، اور وہاں ایک عجیب منظر دیکھا تھا۔

ریلوے پلیٹ فارم پر ایک پتھر توڑنے والی عورت تھی جس کی چھاتیاں ننگی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ نہ جانے کیوں؟ مجھے اس کا علم نہیں تھا، میں بھی دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح خود کو خواہ مخواہ مجاز سمجھنے لگا — عورت کا بچہ اس کی گود میں بیٹھا رو رہا تھا۔ وہ بائیں چھاتی کو کھینچ رہا تھا اور دائیں چھاتی کو چوسنا چاہتا تھا، لیکن پتھر توڑنے والی عورت شاید کسی ذہنی پریشانی میں کھوئی ہوئی تھی۔

یہ سچ ہے کہ ہم سب کسی ایک گونج کی آواز ہیں۔ چلتی ہوئی نہروں میں — تاریک غاروں میں — پھیلے ہوئے آسمانوں میں — صرف ایک ہی گونج کی آواز ہیں —

وہ ایک دم اٹھا۔ اور کہنے لگا —

"واقعی سچائی کا کوئی انت نہیں"

— —

نقیض

تم غصہ کیوں ہوتے ہو؟

میں کہوں گا، کہنے دو، مت روکو بات کڑوی ہی سہی، لیکن سچ بات کہنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ کتنی ہی ناقابلِ سماعت باتیں کانوں میں محفوظ ہیں، جن کا دکھ بھاگتے ہوئے لمحوں میں، نا اہل ثابت کر دیتا ہے۔ افسوس تو وقت کے گزر جانے کا ہوتا ہی ہے۔ خواہ بات منفی ہو یا مثبت۔

میں کہوں گا ــــ ہم دراصل دھوئیں کی اولاد ہیں اور یہی دھواں ہماری قسمت ہے۔ شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ ہم دھواں ہی ہیں۔ نیلے آکاش کا ایک انگ ہیں۔۔۔۔ میری دانست میں ہمارے اسلاف دھول کی اولاد تھے۔ جو زمین سے اڑ کر زمین میں دھنس گئے۔ کئی نقش قدم بے نیل و مرام فنا ہو گئے۔

ہمارے ورثے کی بات ہی کیا۔ ہم نے کتابوں سے اپنے اسلاف کی جنم پتری ڈھونڈھ نکالی۔ ورنہ ان کی بات کا ہمیں کیا علم ہوتا۔ بے بہرہ ہوتے۔ وہی داستانیں جو کتابوں میں بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ انھیں پڑھ کر آنکھیں نمناک ہوتیں، یا خیرہ ہو جاتیں۔ ہمارے نام سے انھوں نے ژولیدگی

کی ایک رزم کھول رکھی تھی۔ جہاں ہم نے ژولیدگی کو دیکھا تو ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور بہادری کا درس دیا گیا۔ جس کا عذاب ہماری آنکھیں مسلسل سہے جا رہی ہیں۔ بے خواب آنکھیں ـــ ریت کی طرح اڑتا ہوا قلب بھی یکسر خاموش ہو گیا۔ گویا یہ دھول کی اولاد ہمیں اپنی طرح متشکل کرنے میں ناکام ہو گئی تو یہ جان کر ہم نے دھوئیں کی اور نظریں پھیلا دیں۔ جہاں گڈمڈ، کئی ہزار چہروں میں بھی کوئی ہمارا چہرہ نہ بنا سکا۔ یہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تو نہیں کہ ہمیں گوشت پوست کے اندر خون سے عاری لوتھڑا سونپا جاتا۔ ہم نے اس کاوش کی سبیل نکال لی۔ وہ اولاد جو دھوئیں سے نمودار ہوئی تھی، خاک کی شکل میں ہماری رگوں کو چومتی تھی۔ انھیں بیزار کر دیا۔ ہم نے زہرآلود گھوں کا ایک جنگل پھیلا دیا۔ ہم گنہگار ہیں۔

دھرتی کی کوکھ سے جنم لینے والی ساری معیشت گنہگار ہونے کا ہی درس دیتی ہے۔

ہماری گنہگاری ازل سے ابد تک برقرار رہنے کے لیے کوشاں ہے۔ ہم نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ ہم روشنی ہیں، اور نہ ہی اس کرب کا جواز پیدا کیا ہے۔ کیونکہ ہم دھواں دار اولاد ہیں۔ جن کا رشتہ یقیناً نیلے آکاش سے مستحکم ہے۔ دھول کی اولاد ہمیں مذمت کا احساس دلا کر یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ ہم مذمت سے خوف کھائیں گے۔ ہم نے انھیں نروس کر دیا۔ ہم نے وعدہ بھی نہیں کیا کہ ہم تمھاری بداعمالیوں کا ازالہ کریں گے۔ کیوں تم ہمیں میٹھی نظروں سے دیکھتے ہو۔ ہم بے عمل نہیں ہیں۔ ہمارے پاس کوئی سلطنت بھی نہیں ہے۔ ہم خالی ہاتھ آئے ہیں، خالی ہاتھ چلے جائیں گے۔ تمھیں تو سب کچھ دیا گیا۔ کیونکہ تم نے غلطی سے، ہم سے پہلے جنم لیا تھا۔ تم نے اپنے نقشِ پا کو بھی محفوظ

نہیں رکھا ۔ اور ہمیں دھوئیں کے حوالے کر دیا ۔ ہمارے لیے یہی مقدر بن کر،
ہماری مجبوری پر کفِ افسوس ملتا ہے .... ہماری راتیں بے کیف ہیں اور
ہمارے قلب دھوئیں سے دھندلا گئے ہیں .... چہار سو دھواں ہے ۔ ہم
آکاشں کا ایک انگ بن جائیں گے ۔ تم دھواں تھے ۔ زمین کے ہو گئے ۔

— —

مکالموں کے درمیان

پہلا:۔ ارے سُنا تم نے ۔

دوسرا۔ کیا ہے بھئی، کچھ منھ سے تو پھوٹو ۔

پہلا ۔ بس کچھ ہی دیر میں ہم ایک ایسی جگہ چلے جائیں گے کہ جس کا ارمان کئی دنوں سے، یوں سمجھو کہ ازل سے ہی تھا ۔

دوسرا۔ کون سی جگہ ۔۔ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے ۔یا صرف سبز باغ دیکھنا ہی تمھارا شیوہ ہے اور ہاں تم اپنی خوش سماعت کو بھی بھول کر ٹھیک ٹھیک سننے کی عادت بھی ڈالے ہو یا نہیں ۔

پہلا ۔ کیا کہہ رہے ہو ۔

دوسرا۔ وہی جو تمھارے لیے ایک حقیقت ہے اور میں کیا کہہ سکتا ہوں ۔

پہلا۔ تم ہمیشہ اضافتوں میں بات کرنے کے عادی ہو ۔

دوسرا۔ ارے تم کیا کہہ رہے ہو۔ کچھ سوچ بھی رہے ہو ۔

پہلا۔ وہی تو کہہ رہا ہوں جو تم سوچ رہے ہو ۔ اور تم اکثر ایسا ہی سوچتے ہو ۔

دوسرا۔ خیر چھوڑو اس قصہ کو۔ ہاں تمہیں یاد ہے۔ کل ہم نے دو سانپوں کے درمیان کیا دیکھا تھا۔ کل سورج غروب ہوتے ہوتے دیکھا تھا نا؟

پہلا ۔ ہاں ہاں یاد آیا۔ وہی نا، وہ سانپوں کے درمیان ایک پیاری پیاری بھولی بھالی لڑکی انگلیاں نچا نچا کر کہہ رہی تھی "منش کی آزادی کا راز بس ایک شے میں ہے۔ میرے پاس آؤ۔ میں دکھائے دیتی ہوں" مگر کمبخت نے دکھایا نہیں۔ صرف تمہاری طرح کہتی ہی رہی۔

دوسرا۔ تمہیں لونڈیا کے علاوہ بھی کوئی بات یاد ہے۔ تم کل سورج ڈوبتے ہوئے کیا دیکھ رہے تھے۔ صرف لونڈیا۔

پہلا ۔ تم بھی عجیب بھلے مانس ہو۔ سورج کی بات کہہ رہے ہو، جو کبھی غروب ہونے والا نہیں ہے، اچانک کیسے غروب ہو گیا۔!

دوسرا۔ مگر جاتے جاتے تمہیں بخشا نہیں۔ تمہارے جسموں کو پی گیا.... اب تم صرف روح روح کے نام سے پکارتے رہو۔ تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ وہ آخر ہے کیا شئے — جو نظر بھی آتی اور نہ جس کو چھوا جا سکتا ہے اور ذائقہ بھی نہیں رکھتی — پھر —

پہلا ۔ پھر اور کیا۔

دوسرا۔ پھر کیا ہوا۔ سورج آج تک غروب نہیں ہوا۔ ویسے ہم نے وقت کے بدلتے ہوئے نئے نئے الفاظ گڑھ لیے ہیں پر وہ تو وہیں محفوظ و مخصوص ہو گیا ہے شکلیں بدل گئی ہیں۔

پہلا ۔ ہٹاؤ یار — تم عجیب عجیب باتیں کرتے ہو، کوئی سر نہ پیر۔

دوسرا۔ تم کون سی سر پیر کی بات کرتے ہو۔ تمہیں چاند کی باتیں بھی پسند نہیں آتیں اور سورج کی بات بھی تمھارے حلق کے نیچے نہیں اترتی تو پھر اور کون سی بات سمجھ میں آتی ہے۔ تمھارے دماغ میں کچھ ہے بھی یا یوں ہی اس کا بوجھ سہار رہے ہو۔
اور سنو! کل سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد ایک اہم اطلاع سنائی دینے والی ہے کہ شب بیدار لوگوں کے نام ایک دلکش اور حسین پیغام ملنے والا ہے۔

پہلا۔ کیا سچ ۔۔ کون سا پیغام ہے۔

دوسرا۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا تم شب بیداروں میں سے ہو؟

پہلا۔ ہاں میں انھیں میں سے ایک ہوں۔

دوسرا اچھا تو یہ بتاؤ کہ کل رات جب سورج ٹھیک ہمارے سروں پر تھا مگر وہ نظر نہیں آرہا تھا تم کیا کر رہے تھے؟

پہلا۔ پھر تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ رات میں اور سورج ۔!

دوسرا۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ کچھ بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتا ۔

پہلا۔ دیکھو تم مجھے ہر وقت ذلیل کرتے رہتے ہو۔ میں تم سے خفا ہو جاؤں گا۔

دوسرا۔ اچھا لو سنو! خفا نہ ہو۔ پہلے سگریٹ پی لو اور ہاں سنو ۔۔۔ شب بیداروں کے نام سانپ چھوڑے جائیں گے۔

پہلا۔ سانپ ۔

دوسرا۔ کیونکہ انھیں آرام کی نیند آئے گی۔

پہلا۔ کیا بکتے ہو ۔ ایک اذیت کا سامنا ہوگا۔

دوسرا- اذیت کا ہے کی ۔ آرام ارے بابا آرام ۔

پہلا- اذیت یعنی آرام ۔

دوسرا- ہاں ہاں آرام، ایک ذرا سی دیر میں آسمانوں میں رہو گے پیارے

پہلا- تمہیں الفاظ میں کچھ فرق محسوس ہوتا ہے یا نہیں ۔

دوسرا- کیوں نہیں ۔ مگر میں جب کچھ کہہ رہا ہوں وہی ہو گا مجھے مٹی کے چھا دیو !

پہلا- نہیں میرا نام شب بیداروں سے خارج کر دو ۔

دوسرا- گھبرا گئے ۔ تو اب مانتے ہو کہ سورج ہمارے جسموں میں، ہماری رگوں میں ہمارے دماغوں میں اپنی پوری شوکت کے ساتھ حدت پہنچا رہا ہے ۔

پہلا- مگر یار تم ذرا سختی سے کام لے رہے ہو ۔ کچھ نرمی سے کام لو ۔

دوسرا- ۔ دیکھا ۔ تم ہمیشہ ہلکے ہلکے الفاظ اور مفہوم میں بولنا اور سمجھنا چاہتے ہو ۔

پہلا- نہیں تم زیادتی کر رہے ہو ۔

دوسرا- یہ فرض بھی کر لو کہ میں نے تمھارا دل بہلانے کے لیے ایسا کہہ بھی دیا تو کیا ہو گا ۔ ہونی کو کون روک سکتا ہے ۔

پہلا- یہ تو بتاؤ کہ سورج کبھی مکمل طور پر غروب نہیں ہوتا ۔

دوسرا- ہرگز نہیں ۔ چھوڑو ایک اور سگریٹ پی لو

پہلا- کیا تم نے سورج کو اپنی آنکھوں سے رات میں بھی دیکھا ہے ۔

دوسرا- پھر تم وہی بات کرتے ہو ۔ رات میں بصارت سے نہیں بصیرت سے کام لیا کرو ۔ پھر دیکھو، جو میں کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے کہ غلط ۔

پہلا۔ وہ کیسے

دوسرا۔ وہ پتھر ہے نا۔۔ تمھاری آنکھوں کے سامنے اس پر اپنا سر زور زور سے پٹخ لو۔ سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔

پہلا۔ پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔

دوسرا۔ تمھیں یاد نہیں ۔۔ دو سانپوں کے درمیان کیا تھا۔ کل سورج غروب ہوتے ہی۔

پہلا۔ کیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔

دوسرا۔ کیا وہ پیاری پیاری، بھولی بھالی لڑکی نہیں تھی۔

پہلا۔ تم نہیں سمجھے ۔۔ وہ دونوں سانپ مر گئے تھے۔ ان کے درمیان اور کچھ بھی نہیں تھا۔

دوسرا۔ ۔۔ کیا۔ ۔۔ سچ ۔۔ !!!

--

ایک چٹھی / ایک افسانہ

آج غیر متوقع جلد ہی کمرے پر پہنچا۔ کپڑے بدلے اور بستر میں گھس گیا۔ تھکان شریر میں در آئی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔

رات دیر گئے آنکھ کھلی تو دیکھا لائٹ برابر جل رہی ہے۔ اٹھا۔ سوچا۔ ذہن پر زور ڈالا کہ میں یہاں کب آیا؟ میری آنکھ کیسے لگ گئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کمرے کی دیواروں کو دیکھنے لگا۔ پھر بستر پر لیٹ گیا۔ سونے کی کوشش کی۔ نیند آنکھوں سے بہت دور چلی گئی تھی اور جسم کی ساری تھکان بوجہ آرام ختم ہو چکی تھی۔

لائٹ کی روشنی میں، اپنے دونوں ہاتھوں کی لکیروں کو بغور دیکھنے لگا۔ ہاتھوں کی ساری لکیریں غائب ہو چکی تھیں۔

.... میں جن شب و روز کے سفر سے گذر رہا ہوں۔ وہ ایک مشکل سفر ہے۔ بارہا سوچوں کے عمل میں کسی قسم کا تدارک دستیاب نہ ہو سکا۔ جہاں تک صبر و تحمل کا دامن وسیع ہوتا ہے، اتنا ہی ذہنی بھول بھلیوں کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سدِ باب ناممکن ہے۔ اس وسیع سمندر میں بیشمار لہریں، ہچکولے لیتے ہوئے، شریر کے انگ انگ میں، ایک ہیجان انگیز کیفیت

طاری کرتی ہیں، ہاں وہی شام وسحر ـــــ

رات پگھلتی جارہی ہے ـــــ

میری سنو، کہ الفاظ غم ہیں ۔ حسرت و انبساط کے سمندر ہیں رنج و غم
کی پرتیں پنہاں ہیں ۔ وہ کون تھا، جو لفظوں سے پہلے جنم لے چکا تھا ۔ میں ہی
تو تھا ۔ میں کہ لفظوں کا خالق، میں کہ لفظوں کا فن کار ۔ لفظوں کے اندر سے
اُبھرتا ہوں ۔ لفظوں میں کھو جاتا ہوں ۔ میری آرزو کی کئی لہریں ہیں ۔
ان لہروں میں گتھم گتھا بھی ہوتا ہوں، اور شانت بھی ہو جاتا ہوں ۔ جب
اتصال لفظوں اور معنوں میں ناپید ہوتا ہے تو، میں گونگے ہونے کے احساس
میں چپ ہو جاتا ہوں ۔ میری سنو کہ الفاظ غم ہیں ـــــ

رات ـــــ موسم گرما کی شدید ترین گرم رات ۔ اور پھر تنہائی ۔
اس قدر بے چینی کہ ایک پل بھی سکون نہیں ہے ۔ میں نے اسی حالت میں یہ
طے کر لیا ہے کہ اپنے اُس دوست کو ایک چھٹی لکھوں ۔ جس سے ملے ہوئے ایک
طویل عرصہ گزر چکا ہے ۔ نہ جانے کیوں اُس نے خاموشی اختیار کر لی ہے ۔

چھٹی ـــــ

نام ذہن سے اترتا جا رہا ہے ۔ اس کی خاموشی نے اس کے نام کو ذہنی
بھول کا جواز بنا لیا ہے ۔ کیوں ـــ ؟ اس 'کیوں' کے لیے میرے پاس
کوئی جواب نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اتنا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دوستی
کے درمیان یقین کی قوت دراصل اس کی بنیاد ہوتی ہے ۔ ورنہ ہم اپنی
اپنی عیاری میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔

۔ ۔ ۔ ۔ میرا دوست، جس کو میں ازل سے جانتا ہوں ۔ اور اس کی دوستی
پر فخر بھی کرتا ہوں ۔ جیسے ہی میں نے لیٹر پیڈ اٹھایا ۔ دفعتاً میرے ذہن میں

اس کا نام اُتر آیا - اُس کی خیریت کی اطلاع بہت دن ہوئے نہیں ملی - کہیں وہ ایسی اُلجھن میں تو نہیں پھنسا ہے، جس کی وہ توقع نہ رکھتا تھا - کہیں گُم تو نہیں ہوا ؟ ذہن میں مختلف سوالات جنم لیتے ہیں -

بات اتنی ہی ہے کہ وہ میرا ہم خیال ہے - دوستی دراصل ان ہی بنیادوں پر ہوتی ہے - پھر میں سوچتا ہوں کہ میرا دوست آرام کے دنوں میں اپنی زندگی کے خوشنما لمحوں کو گزار رہا ہوگا - کچھ عجیب سا لگتا ہے - ایسا سوچتے ہوئے ..... اچانک میں اپنے ہاتھ کی ریکھاؤں کو دیکھتا ہوں - ہنوز غائب ہیں - رات اتنی گرم ہو چکی ہے کہ جہنم کی آگ بھی اس کے سامنے آجائے تو شرما جائے - ماحول ہولناک سناٹے کا ایک انگ بن چکا ہے اور وجود ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتتا جا رہا ہے - اس افراتفری میں، میں نے اپنا قلم ہاتھ میں اُٹھا لیا ہے -

ڈیر !

تمھیں چھٹی لکھنے بیٹھا ہوں تو میرے پاس الفاظ گُم ہوتے جا رہے ہیں - جن کا مجھے یقین شعوری طور پر ہو رہا ہے - ..... میرا خیال ہے کہ ہم سب اپنی خودی میں ہی ایک دوسرے کے معمولی حالات جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور جہاں ہم غیر معمولی ہونے کے اندیشے سے گزرتے ہیں تو ہم ایک دوسرے سے کتراتے ہیں - ہم میں وہ سب کچھ نہیں ہے، جس کے لیے ہم اپنی ذات سے غیر مانوس لفظوں کی تشکیل کریں - کیونکہ جتنے بھی مانوس الفاظ ہیں، اُن سے ایک دوسرے کو متاثر کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں - بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ ہم نے اس طرح خود کو دھوکا دیا ہے، تو سچ ہی ہوگا - خیالات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے - اُسی طرح جب

ہم سمندر کے پانی میں ایک چھوٹا سا پتھر پھینک کر اس کے دائروں کو پھیلتے ہوئے دور دور تک دیکھتے ہیں اور ان ہی دائروں میں مقید ہو کر، خود کو بے بس جان لیتے ہیں۔

ہاں تو ڈیر!

ہماری بے ثبات زندگی کا رونا ایک ڈرامہ ہے۔ کیونکہ ہمارے تجربے کے ایک ایک انگ پر کیل ٹھونک دی گئی ہے۔ جہاں ہم نے گھبراہٹ محسوس کی ہے، وہاں ہم نے اپنی کمزوری کا اعلان بھی کیا ہے۔ ان سچائیوں کا ذکر ہی کیا، جن پر بھی سر دھنتے ہیں۔ کیا وہ سب سچائیاں قابلِ قدر ہیں؟ کوئی بھی اس بات سے متفق نہیں ہو سکتا۔ جس سچائی میں کسی قسم کی خود غرضی نہ ہو۔ اور اس سے انکار نا ممکن ہے کہ ہم خود غرضی کے عمل سے نا آشنا ہیں۔ یہیں سے ہمارے لیے ایک جھوٹ کا سفر طے کرنا پڑتا ہے اور جھوٹ ہی کی روشنی میں ہم سچائیوں کو پا لیتے ہیں۔ اگرچہ ہم خود غرض ہیں، یوں مان لو کہ اگر سچائیوں سے انحراف کرتے ہیں تو ہماری کمزوری کی وجہ ایک عمل ہے۔ جھوٹ — اور اس عمل تک ہماری رسائی زندہ رہے گی ..... یہ قابلِ اطمینان بات ہے۔

میں یہ کہوں گا کہ ہماری دوستی اور ہمارے رشتے خود ہماری ضرورتوں کی تکمیل کا ایک وسیلہ ہیں۔ اگر اس سے علاحدہ کیا جائے تو ہم نامکمل ہونے کے احساس میں مبتلا ہو جائیں گے۔

ڈیر ..... تم بے وقوف ہو، نہ ہی کوئی اور — تم خواہ مخواہ گم ہو گئے ہو۔ ہم سب خود کو عقل مند جان کر ہی، اس طرح ایک دوسرے کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ساری سچائیاں بیکار ہوتی ہوئی بھی بھلی لگتی ہیں۔ یعنی بارہا سچائیوں کے عمل کے درد سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی ایک کسک محسوس کرتے

ہیں کہ ہم کچھ کھوتے جا رہے ہیں ۔ یہ ایک سلسلہ ہے جس کو ہم سب طے کرتے رہتے ہیں ۔ اور وہ جس کی تلاش خود سے پیدا ہوتی ہے اور خود میں ہی تحلیل ہو جاتی ہے ۔ میں اور تم ایک علاحدہ راہ کی جستجو میں ہیں ۔ لیکن تم یہ مان لو کہ میں اور تم ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں ہو سکتے ۔ ویسے ہم ایک دوسرے سے فرار کر سکتے ہیں ۔ کیا ہم نے ان حالات میں کامیابی کو اپنے سینے سے لگایا تھا، جہاں ہمیں سب کچھ میسّر تھا ۔ نہیں ۔۔ ہم نے وہیں سے راستوں کا انتخاب کر لیا تھا، جہاں ہمیں سب کچھ میسّر تھا ۔ تو پھر کیوں وقت کے گزر جانے کا افسوس کرتے ہیں ۔

میں یہ چٹھی اس احساس کے ساتھ مکمل کر رہا ہوں کہ قلم کی سیاہی اپنے وجود کے مٹنے کا احساس دلا رہی ہے ۔ اب میں تم سے اتنا ہی کہوں گا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے محض وقت گزاری کا عمل نہیں ہے ۔ بلکہ دور بہت دور جہاں آکاش کی سیمائیں ختم ہوتی ہیں ۔ وہاں ہم دونوں ایک ہیں ۔

۔۔۔ رات پوری طرح پگھل چکی ہے اور آکاش صاف و شفاف آئینہ کی مانند نظر آ رہا ہے ۔ چاروں اور آکاش ہی آکاش ہے ۔

▬ ▬

ادھوری حکایتیں

میں محض نہیں ہوں۔

اچانک یہ احساس جاگتا ہے تو میں اپنے اطراف دیکھتا ہوں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ صرف میں ہی ہوں۔ "محض" کیوں خواہ مخواہ میری ذات میں اضافت کا بوجھ دلا رہا ہے۔ میری سائیکل کی رفتار میں خود بخود کمی پیدا ہوتی جارہی ہے۔ ہیبت ناک چیخ کا تعلق ذہن ہی سے تو ہے! اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ذہن اور معدے کے درمیان باقی جسم "محض" سا لگتا ہے ۔۔۔ جھنجھلاہٹ خواہ مخواہ میں نے خود میں یہ بات پیدا کرلی ہے کہ آج طبیعت بوجھل ہے۔ کالج نہیں جانا چاہیئے۔ اس کے بجائے بوجھل پن کو دور کرلیا جائے۔ جواز ڈھونڈنا ضروری ہوگیا ہے۔

نیند ۔۔۔ اب نیند ہی تو اپنا آخری ورثہ رہ گئی ہے، دوپہر کی نیند میں بھی خواب نظر آتے ہیں۔ خوابوں سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ کچھ دیر افسوس ہوتا رہا ہے۔ خیر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہی ہے ہے۔ بس اتنا ہی زبان اگل دیتی ہے کہ دوپہر کی نیند بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ نقصان دہ ہی تو ہے کہ آشنا حقیقتیں نقصان دہ ہوتی ہیں۔

ذہن اور معدے کے درمیان باقی جسم محض شا، کیا معنی رکھتا ہے۔
لیکن کیا ندی کے کنارے چھوٹی سی جھونپڑی بنائے بغیر دن بتائے جا سکتے ہیں۔
لیکن وہاں سگریٹ؟ ویسے چار مینار سگریٹ سے سینہ جلتا ہے' اور سگریٹ کی
علّت سے چھٹکارا ممکن نہیں۔

سائیکل بار بار رکتی ہے۔ ہاتھ پر بوجھ کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔
جب ہم سائیکل کے بوجھ بنتے ہیں تو ہمیں کسی قسم کا گمان نہیں ہوتا۔ محض
جلدی پہنچنے کا ایک واضح مطلب رہتا ہے اور پھر آرام۔ آرام بے مطلب
سی بات ہے۔ بعض بے مطلب باتیں کچھ دیر کے لیے سہہ لی جاتی ہیں۔ کہیں
نہ کہیں سراب کے وجود کو تسلیم کر لینا بھی تو ضروری ہے۔ اور اب سائیکل روک
رہی ہے تو یہ احساس ہو رہا ہے کہ خواہ مخواہ سائیکل میرے لیے بوجھ بنی ہوئی ہے۔
کیا بے جان چیزوں میں جان دار چیزوں سے زیادہ انتقام کا جذبہ ہوتا ہے!؟
ندی کے کنارے چھوٹی سی جھونپڑی بنائے جائے۔ وہاں بہتی ندی ہوگی
اور میں۔ آسمان صرف آسمان' چاروں سمت آسمان ہی ہوگا اور زمین کے جسم پر
ہریالی۔ پبلک گارڈن ہریالی دور دور تک سوکھی ہوئی گھاس دکھائی دے
رہی ہے۔ اِدھر اُدھر نظریں گھومتی ہیں گارڈن میں گائے بھینس بکری
اور گدھا۔ میونسپلٹی کا چپراسی۔ بے قرار۔ گارڈن کا مالی ایک بے سایہ
درخت کے نیچے کلہاڑی لئے ہوئے بیڑی پھونک رہا ہے کیا درخت "محض" ہے؟
ایسا نہیں۔ موسم بہار کا منظر ہے۔ ہریالی تو نہیں ہے لیکن وہ گائے بھینس
بکری کی مشترکہ ملکیت تو ہے۔ مایوسی —— اور گدھا، کاغذ کھاتا ہے۔
کاغذ کی کوئی قدر نہیں ہے۔ چاہے وہ سفید ہو یا سیاہ۔ کاغذ ہضم کیا جا سکتا
ہے —— دھرتی —— یہ تو بانجھ لگتی ہے —— تارکول کی سڑک دور تک چلی گئی ہے۔

شہر اور جنگل کے درمیان پگڈنڈیوں کی صورت سڑکوں، شاہراہوں، گلیوں اور چھوٹے چھوٹے راستوں میں تبدیل ہو چکی ہے تو کیا جنگلوں کو بھی شاندار بنایا جائے گا؟ دھرتی بانجھ نہیں ہے۔ دھرتی بہر صورت جیتی ہے دھواں پھیل گیا ہے۔

تجدیدیت کی تپش منطقۂ حارہ سے محوِ خواب۔ چلچلاتی دھوپ بارہ مئی — تارکول کی سڑک پر میونسپلٹی کا چپراسی بے قرار ادھر ادھر ٹہل رہا ہے اور چوراہے پر کھڑا پولس مین ہر لمحہ زور زور سے نمک خوار آواز نکال رہا ہے۔ خالص نمک کہاں سے دستیاب ہوگا اور کچھ چاہیے — تارکول کی سڑک پر بے پناہ ہجوم کوئی جلوس ہڑتال کی نوعیت کسی غم و غصّہ کا اظہار نہیں۔ مکمل دس گھنٹوں کی اجتماعی تفریح......

سانس کا فاصلہ آس تک

اور

نین کا فاصلہ چین تک

ایک فاصلہ متعین کیے بغیر چلنا محض حماقت کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ سوالات بے کار ہیں۔ بہر کیف کچھ فاصلے بغیر کسی احساس کے طے ہو جاتے ہیں.... اب آسمان کہاں ہے؟ دھوئیں کی بارش دیکھ لی۔ گھٹن کا احساس کیوں جاگا — یہاں کوئی بھی تو نہیں ہے۔ بھوک اور ہوس کا کوئی خیال نہیں ہے اور خواہشات بھی تو اپنا راستہ بھول گئی ہیں۔ یوں بعض وقت محسوس ہوتا ہے کہ دھوئیں کے پس منظر میں گھٹن، بے چینی، خوابوں کی بیداری، تقدس کی تنگ دستی، شہر بھر کے مگرڈوں کا کرب اور کوئی لاحاصل پروگرام۔ پروگرام کی تکمیل تک ذہن کو فائر بریگیڈ کا دھماکہ سنائی دیتا ہے۔ جلوس سے مسلسل

بے ہنگم چیخوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔

ایک دو ایک دو

پھینک دو پھینک دو

کان پھٹتے ہیں زور زور سے چیخیں اس سے آگے کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔

دو منزلہ مکان پر کھڑی لڑکی متعجب نظر آ رہی ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہجوم کی ہراسانی کو دیکھ رہی ہے۔

ایک دو ایک دو

....

زور زور سے چیخیں۔

ایک نوجوان اپنے بازو میں ٹرانسسٹر لٹکائے، ہجوم سے گزر رہا ہے۔ آکاشش وانی سے مختلف آوازیں آ رہی ہیں یہ آکاشش وانی ہے..

اب گیت سنیے "یہاں کوئی نہیں تیرے میرے سوا ...."

ایک دو ایک دو

پھینک دو پھینک دو

پورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا ہے اور سورج حلق میں پھنس پڑا ہے .....

اے بھائی دو گلاس پانی لانا

ہاں ساب یہ پانی اور .....

چائے۔ (پانی کا معاوضہ)

چائے کا ایک گھونٹ لیا جاتا ہے۔ گھونٹ حل پذیری کیفیتوں سے ماورا نہیں۔ چائے پورے معدے میں حل پذیری شکل اختیار کر چکی ہے۔

بجو یدیت کی تپش منطقہ حادثہ سے محو خواب ـــــ
کیا ندی کنارے جھونپڑی بنائی جا سکتی ہے؟ سگریٹ جلائی جاتی
ہے اور پھر میں لاوارث راستوں سے انجانے دیش کی طرف چلنے لگا ـــــ
دھرتی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دھرتی تو ہمارے لیے بنائی گئی ہو۔
لیکن اجنبیت ـــ سوالات بے کار ہیں۔
دھوئیں کا کوئی واضح مقصد ہی نہیں جواز کچھ بھی مل سکتا ہے۔ کہیں
نہ کہیں رکنا ہی پڑے گا۔ جواز اور حقیقت کے درمیان جیسے والے فعل،
باتیں سب کچھ بے کار ہیں۔ جواز اور حقیقت دو علاحدہ علاحدہ ہیں اور
دونوں کی اپنی اپنی سچائی ہے، سچائی کے سفر کی تکمیل علاحدہ علاحدہ جگہوں
پر مکمل ہے۔
اجنبیت بے معنی ہے۔ بارہا خود میں اجنبیت پیدا ہوتی ہے۔ سائیکل
چھوٹ گئی ہے .... شہر اور جنگل کے درمیان پگڈنڈیوں کی صورت، سڑکوں
شاہراہوں گلیوں اور چھوٹے چھوٹے راستوں میں تبدیل ہو چکی ہے
سب کچھ نیا نیا سا لگتا ہے۔ میں لاوارث راستوں پر چلنے لگتا ہوں۔
ہر طرف انجانا پن ہے.... !

ــ ــ

نہیں نہیں ہاں ہاں

پتہ نہیں کیوں، مجھے دو آدمیوں سے مل کر خوف و گھبراہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔

ایک پاگل —

دوسرا شرابی —

حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں ہی ٹوٹتے، بکھرتے، بے ربط اور بے ترتیب سچائیاں بیان کرنے لگتے ہیں۔ ایسا ہی ہوا، کہتے ہیں کہ مکان میں چھپکلیاں کثرت سے ہو جائیں تو انڈے کی زردی کھا کر، معدے کو سکون عطا کر کے، اس کے چھلکے دیواروں میں بنے ہوئے یا بنائے ہوئے محرابوں میں رکھیں۔ تاکہ انڈے کی بُو سے چھپکلیاں بھاگ جائیں۔ اس دیسی فارمولہ پر عمل کیا گیا۔ لیکن چھپکلیاں ہیں کہ ابھی دیواروں کے محرابوں اور چھت کے سوراخوں میں بدستور سانس لے رہی ہیں۔ جہاں تک، تنگ کرنا ہے، وہ مسلسل تنگ کیے جا رہی ہیں۔ خوف بھی کس قدر جان لیوا ہے کہ چھپکلی کا زہر، اس قدر مضرت رساں ہوتا ہے کہ آدمی انجانے میں کھا جائے اور دیکھتے ہی دیکھتے لقمۂ اجل ہو جائے، اُس نے کہا تھا کہ عہدِ عتیق میں ہم پیدا نہیں

ہوئے، اچھا ہوا۔ ورنہ مرد کو ہی بچہ پیدا کرنا پڑتا تھا۔ اور ان کی نگہداشت بھی ۔۔ ناکارہ اور نکھٹو مردوں کی عورتیں دن بھر چلچلاتی دھوپ ہے یا بارش اور سردی کے دن، خوب خوب کما کر لاتی ہیں اور پہلے مرد کو اپنا پسینہ پلاتی ہیں ۔۔ مرد نکھٹو پسینہ پی پی کر مدہوش ہوتا ہے اور رہی سہی ساری صلاحیتیں پسینہ پینے میں صرف کرتا ہے۔ اچھا ہوا، ہیں اور تم ان میں سے نہیں ہیں۔

سُنا کرتے ہیں کہ پُرانے زمانے کے لوگ حرّافوں کو گھر بُلا کر اپنی مردانگی کا جشن مناتے تھے اور کچھ تو ایسے بھی تھے کہ اُن سے ازراہ ہمدردی تہذیب کی ناک کو اونچی ہی اونچی کرتے تھے۔ یعنی عورت، وہ بھی بازاری عورت سر پر سوار تھی۔ عورت کے وجود سے انکار ممکن نہیں، لیکن تہذیب کی ناک کو اونچی کرنا۔ اور جشن مردانگی ۔۔ کہاں کی عقل مندی تھی۔ اچھا ہوا کہ اب سب کچھ ختم ہو گیا۔ ورنہ ایسے ڈرامے ناک اور ذہن میں بدبو پیدا کرتے ہیں۔

"میں مٹی میں پاک خوشبو اور آگ میں روشنی ہوں۔ میں سب جاندار وں کی روح میں رواں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میری حسرتیں عود، لوبان، اگربتی، خوشبودار مسالوں اور آب زمزم میں تحلیل ہو گئی ہیں۔ اور آب زمزم کے چھینٹوں سے پورے جسم کے سیاہ سُرخ دھبے دُھل چکے ہیں۔ یوں ہی ایک تصوّر میرے ذہن سے آنکھوں میں اُبھرنے لگا ہے۔ اور تصوّر کے نازک تخت پر بیٹھی ہوئی ایک ننھی پری آنکھیں کھولتی ہوئی، اپنے اطراف دیکھتی ہے کہ بے حس و حرکت آدھا جسم انسان کا اور آدھا جسم پتھر کا لیے پڑے ہوئے ہیں۔ دیو ہیکل پرندے، خلاؤں کی اُور بڑھ رہے ہیں۔ میرے خیالات کی آگ پر پستول کی گولیاں مسلسل برسنے لگی ہیں اور جذبات سُرخ

بھٹی میں تپنے لگے ہیں اور احساس کی انگلیاں ہوا میں لرز رہی ہیں۔

میرے اعضا بھی کب تک میرا ساتھ دے سکتے ہیں۔ میرا پورا جسم سفید اور پیلا پیلا ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی تمام سوچوں اور احساسات کو خندق میں پھینک دیا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ گہرا اور پانی سے بھرا کنواں ہے۔ اور اس کا پانی کبھی نہ ختم ہونے والا تھا۔ اس کے اندر ہی اندر چشمے اُبل رہے ہیں۔ تم بھلے چنگے تو ہو — لیکن یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔

ہاں بھلا چنگا تو ہوں۔ میرا پورا جسم پسینہ سے شرابور ہو چکا ہے، ہر طرف مایع ہی مایع نظر آ رہا ہے۔ خوابیدہ آنکھوں کی تمام حرمتیں ایک گہری گھاٹی میں کود پڑی ہیں۔ اور ٹھوس زبان سیال ہو چکی ہے۔ اور ادھر اُدھر منتشر ہونے لگی ہے۔ سمجھے — اور قوی اور مضبوط ہاتھ حرکت کے سر پر مسلط ہیں۔ اور عقل ماتم کدہ سے آگے نکل چکی ہے۔ تمام طے شدہ پروگرام بکھر گئے ہیں.... زمین تڑخ تڑخ گئی ہے۔ اور آسمان کا سینہ شق ہو گیا ہے۔ خلا کی بے حسی، بے بسی کا روپ دھار چکی ہیں۔ اُٹھتے پیروں کے منصوبے تحلیل ہو گئے ہیں اور میرے اندر اور باہر کے ماحول پر پُر شور سناٹا بہہ رہا ہے۔ اس طرح سب کچھ بہتا جا رہا ہے۔ کیا ہو گیا اور کیسے ہوا — ! شاید ایسا ہی ہونا طے شدہ تھا۔ مگر اتنی جلدی کیسے — ؟ حیرانی دیدوں میں پھنس گئی۔ اور میں انھیں خوابیدہ آنکھوں سے تکتا رہا۔ صرف تکتا رہا۔

تم بڑے عجیب الخلقت آدمی ہو۔ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ عشق ہی سب کچھ ہے۔ برخلاف اس کے اب تم اس کی شدت سے مخالفت کر رہے ہو۔ تمھاری دشنام طرازی کیا معنیٰ رکھتی ہے۔ یعنی تم عشق اور بے عشق کے درمیان لٹک رہے ہو۔ جب ہی تو مجھے جسم کا ایک ایک حصہ خلوتیں آباد کرنے کی طرف اکساتا تھا۔ پہلے بھی تو لتے

نظروں کے سامنے تھے۔ پُرگل اور پُرخار — کیا تم بیک وقت دونوں کشتیوں پر سوار، سمندر کی بے کراں وسعتوں کو پاٹ کرنا چاہتے ہو، اور بین بین چلتے چلتے تھک گئے ہو تو ایک ہی راستہ کے گمان سے باہر ہو گئے ہو۔ اب یوں لگتا ہے کہ راستے ٹھٹھر چکے ہیں یا روز روز کے استعمال سے زاویۂ نگاہ بدل چکا ہے۔ راستہ کا تعین کرنا بھی ایک اہم فعل ہے، ہوا کی مانند چلتے رہنا، کون سی حماقت ہے!

تم باتیں تو بڑی بندھی ٹکی کر رہے ہو، یہ دیوار دیکھ رہے ہو، آج سے چند سال پہلے یقیناً نئی اور خوبصورت تھی اور اپنے طور پر مکمل بھی۔ لیکن آج تو، اس کا پلاسٹر اکھڑ چکا ہے، جگہ جگہ سوراخ پڑے ہیں۔ بہت ممکن ہے میرے اور تمہارے دیکھتے دیکھتے ہی گر بھی جائے گی۔ لیکن تم بڑے سیدھے ہو۔ کبھی دیوار بھی باندھی ہے، دیوار کی نیو، اور اس کے ایک ایک اینٹ اور ایک ایک پتھر اٹھا کر یا خرید خرید کر دیکھو تو تمھیں ایسا لگے گا کہ تمھاری کمر آہستہ آہستہ یا فی الفور ٹوٹ چکی ہے۔ اب گری جب گری —

پھر تم اپنی بکواس بڑھاتے ہی جا رہے ہو، تم ختم کر دو، جو ہوا ہے اُسے بھول جاؤ، تمھاری دیوار کی نیو ہی مضبوط نہیں تھی — ایک اور دیوار باندھ لو، اور ان تمام باتوں سے نجات حاصل کر لو۔ سمجھے۔ نہیں، نہیں — زمین یا جگہ کا کیا ہو۔ ہم ہی اس کی خوبصورتی اور بدصورتی کی شکلیں دیتے ہیں۔ دیکھتے نہیں ہو، وہاں سامنے دیکھو، پہلے تو یہ جگہ سینکڑوں ہزاروں لوگ رفع حاجت کے لیے استعمال کرتے تھے لیکن اب وہیں ایک خوبصورت اور عالیشان مکان ہے۔ اور آج مقدس مقامات اور برگزیدہ ہستیوں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔

پھر تم بھی ایسا کیوں نہیں کرتے کہ گری ہوئی دیوار کو پھر ایک اور مرتبہ ہی شکل نہیں دے دیتے، اور اب تو دیوار کے گرنے کی وجہ سے تمام چھپکلیاں

بھی دم توڑ چکی ہوں گی۔

ہاں چھپکلیاں ۔۔۔! نہیں نہیں ۔۔۔ چھپکلیاں تو میرے اندر تک پہنچ چکی ہیں۔ دیوار اور چھت کی چھپکلیاں تو کب کی دفع ہو گئیں۔ وہ تمام کیڑے جو ان کی غذا تھے، میرے اندر ہی غذا سمجھ کر آ گئی ہیں۔

تم نے شراب تو پی نہیں رکھی ۔۔۔؟

شراب سے کیا ہوتا ہے۔ تم مجھے شرابی بھی کہہ سکتے ہو۔ اور پاگل بھی۔ میں نے کہا تھا نا۔۔۔

ہم اپنے ہی طور پر کسی چیز کو کچھ اور کسی چیز کو کچھ نام دے دیتے ہیں۔ ہم کسی بھی چیز کو بغیر علامت کے سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس شئے کی تصویر ہمارے ذہن میں ہوتی ہے، لیکن جب وہ دھندلی ہو کر ذہن سے غائب ہونے کا احساس دلاتی ہے تو ہم ہی دوسرا اور تیسرا دے کر کنفیوژن میں پڑ جاتے ہیں۔ خیر۔ تم بھی کچھ کہو۔ میں باحواس اور بے حواس صوفی یا شرابی تمھاری نظروں کے سامنے جیتا جاگتا پانچ فٹ سات انچ کا آدمی کھڑا ہوں۔ خیر۔۔۔ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔۔۔؟ (بیٹھے بٹھائے بلا نازل ہو گئی۔) میں۔۔۔ نہیں نہیں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ میں نے آج تک کسی سے کچھ نہیں چاہا۔ بس تم بھلے لگے، اچھے لگے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ تم سے کچھ دیر باتیں کر لی جائیں۔ کہا ہوں بہت دنوں پہلے بھی ہماری ملاقات اسی جگہ اور شاید اسی وقت ہوئی تھی۔ نا تم بدلے اور نہ میں بدلا ہوں۔ شاید تم مجھے 'بدلا بدلا' سے محسوس کر رہے ہو۔ ارے ہاں تغیر و تبدل ہی تو ہمارے جینے میں مزہ پیدا کرتا ہے' ایک دم سے سب کچھ دیا ہی، ہو تو کیا ہے، سب ہی ایک جیسا۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی بدل چکے ہو، 'تم پہلے اٹک اٹک کے، سوچ سوچ کے' ایک ایک لفظ بڑی

مشکل سے، تمھاری زبان سے ادا ہوتا تھا، لیکن اب —— مجھے تم پہلے والے نظر نہیں آتے، بالکل ہی نئے —— البتہ تمھارا چہرہ اور تمھاری باتیں، مجھے ان ہی دنوں میں لے جاتی ہیں۔ کیا تم اب بدلے نہیں ہو —— ؟

ارے ہاں —— نہیں نہیں —— ہاں، خیر، اب مجھے جانے دو۔!

کہاں جاؤگے، ہر جگہ تو سب کچھ یہی ہے، تم میری باتیں سُنی ان سُنی کر رہے ہو، تم میری پچھلی زندگی سے بخوبی واقف ہو، تم سب میرے متعلق جانتے ہو۔!

یہی کہ تمھارے گھر کی دیوار ٹوٹ گئی ہے اور تم یہاں وقت گزار رہے ہو یہی نا ——

نہیں نہیں، لگتا ہے تم جھنجلا گئے ہو۔ میری صاف گوئی اور راستبازی کا برا نہ ماننا ——

نہیں نہیں۔ کوئی بات نہیں (بڑا بدماغ اور کھسکا ہوا لگتا ہے) ایسا لگتا ہے کہ تمھارے اندر چھپکلیاں اُتھل پتھل کر رہی ہیں۔ میں کیوں جھنجلاؤں گا، تم خود سوچ کر کیا سوچ رہے ہو۔ یہی مغز اور بے معنی باتیں کئے جا رہے ہو۔

نہیں۔ میرے یار تم کچھ بھی سمجھو۔ میرا کام تو بس یہی ہے۔ میں جو محسوس کر رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں، کہہ رہا ہوں۔ تمھیں میری باتیں ناگوار گزر رہی ہیں تو یہ علاحدہ بات ہے، میں تو اپنے آپ سے ایمان داری برت رہا ہوں۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ جو کچھ کرتے ہیں اور زبان پر کچھ لاتے ہیں۔ یہ میرا وطیرہ نہیں ہے۔

ہاں ہاں ٹھیک ہے، تم اب کہتے چلے جاؤ۔ میرے یار کیا ہے، تم اپنے آپ کو ہلکا کر لوگے، اب میں سمجھ گیا، تم خود کو مصروف رکھنا چاہتے ہو،

کیا ۔ لیکن ،

نہیں نہیں ۔ پھر تم غلط مطلب نے رہے ہو ۔ میں ہلکا ہو سکتا ہوں ۔
نہیں ۔ میں صرف تمھیں اپنا سمجھ کر کہہ رہا ہوں ۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ۔
کچھ بھی نہیں ، تم مسلسل کہے جا رہے ہو ، اور کہتے ہو کچھ بھی نہیں ۔!
میں تمھیں اپنا سمجھتا ہوں ۔ اسی لیے تو میں تمھیں سب کچھ کہہ رہا ہوں ۔
تمھاری اور میری ملاقات اس سے پہلے نہیں اور اسی وقت ہوئی تھی نا ۔!

ہاں ہاں ۔ ٹھیک ہے ، مگر اب کیا چاہتے ہو ؟

میں میں کچھ بھی نہیں چاہتا ۔ میں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں چاہا ہے ۔
اور اب .....

نہیں ..... نہیں .....

پھر کیوں ، تم پریشان ہو ؟

میں کیوں پریشان ہوں ۔ سچ مچ پریشان دکھائی دے رہا ہوں ۔
مگر کیسے اور کیوں ؟

میں نے کچھ نہیں کھویا جو ہونا تھا ، وہ ہو چکا ۔ اس میں رنجیدہ اور
غمگین ہونے کی کیا ضرورت ہے ۔ میرے یار ۔ کبھی ، کبھی مجھے لگتا ہے کہ مجھ
میں کوئی آتش فشاں پہاڑ پھوٹ رہا ہے ۔ لیکن ایسا کیوں ہو رہا ہے ۔
کیوں ۔ ؟

یہی کیوں ۔ تمھارے لیے عذاب جاں بنا ہوا ہے ۔ تم اپنے ماضی
سے غیر متعلق ہو جاؤ ۔

میں سوچتا تو یہی ہوں ۔ کیا یہ ممکن ہے ۔ تم ایسا کر سکتے ہو ۔ کیا ہمارے
دماغ میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے ۔ جو بیتے ہوئے لمحوں کو بھی محفوظ رکھتی ہے ۔

میں کبھی کبھی زور زور سے سر ہلا کر اپنے سر کے اندر تمام بکھرے ہوئے مواد کو باہر نکال دینا چاہتا ہوں۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تمھارے پاس کوئی اُپائے ہے۔
میرے پاس ایسی کوئی تدبیر یا ترکیب نہیں ہے کہ ہمارے ذہن اور نثر میں جمع ہوئے مواد کو نکال باہر کیا جائے۔
تو پھر یہ سب کچھ ویسا کا ویسا ہی رہے گا۔
ہاں۔ ہاں! بس ایسا ہی سمجھ لو۔ اس کے سوا اور کوئی علاج ہی نہیں۔ کہ ہم مقدور بھر کوشش کریں کہ سب کچھ بھول جائیں۔ ہمیں جبراً ایسا کرنا پڑے گا۔
ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ مگر ایسا ناممکن ہے۔ ناممکن! تم ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ اگر ایسا نہیں کروگے تو تم اپنی ہی قبر کھودو گے' اور اگر تم اپنی قبر کھود لوگے' تو کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بلکہ تمھارا ہی سب کچھ بگڑے گا۔
ہاں ہاں ..... لیکن اس کا کچھ بھی نہیں ہوگا۔
کس کا ــ؟
تم اس کو بہت اچھی طرح جانتے ہو۔
میں ــ!
ہاں ــ ہاں ــ تم ــ میں نے کہا تھا کہ تم مجھے چند سال پہلے یہاں اور اسی وقت ملے تھے۔ اور میں نے اس کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ اور پھر اب ــ نہیں نہیں تم انجان بن رہے ہو۔!
ممکن ہے، میں سب کچھ جانتا ہوں۔ لیکن میں اب تم سے چاہوں گا کہ تم وہ سب کچھ بھول جاؤ، اپنے آپ کو کسی اور طرح معروف رکھو۔ اتنا معروف کہ تم اپنے آپ سے دور ہو جاؤ ــ بس یہی تمھارے لیے ایک طریقہ ہے۔ اس کے سوا تم اور کچھ بھی نہیں۔

میں جانتا تھا کہ تم یہی کہو گے اور اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتے ہو۔ میرے زخموں پر پھاہا رکھو گے۔

ہاں ہاں ۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تم ہی اپنے گھاؤ کو سمجھ سکتے ہو۔

میرے لیے یہ آسان تو ہے کہ میں سب کچھ آسانی سے بھول جاؤں لیکن مجھے اس بات کا رنج نہیں ہے کہ وہ پہلے میرے بڑے بھائی سے رات دن عشق کیا کرتی تھی ۔ ظاہری بات ہے کہ میرا بھائی، مجھ سے پہلے بالغ ہو چکا تھا۔ اور وہ، وہ تو ہم دونوں سے پہلے ہی ۔ سچ مانو، وہ ازل سے بالغ رہی ہے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود میں نے اس کو اپنا سب کچھ دے دیا تھا۔ پر ہر وقت اس کی پرچھائیں، میرے وجود پر ہی نہیں بلکہ میری آتما پر بھی چھائی رہتی تھی۔ میرا بھائی تو ان دنوں مجھ سے کچھ نہ بولا، بلکہ میرا بھائی پہلے کی نسبت بے حد ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ اس نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ میں نے بھی بارہا کوشش کی کہ بھول جاؤں۔ لیکن نہیں بھول سکا۔ میں نے بھول سکتا۔ میرے دوست! میں سوچتا ہوں کہ میرے ذہن میں کلبلانے والے سوالات جائز کیوں ہیں ۔۔۔ کیوں میں لمحاتی طور پر ہی سہی، بھول نہیں جاتا۔

دیکھو! جائز اور ناجائز کی بات چھوڑو ۔ کون سی بات جائز ہے اور کون سی نہیں ۔۔ ہم اپنی ہی بات کو جائز سمجھتے ہیں اور دوسروں کی بات کو ناجائز۔ دراصل ہماری اپنی اپنی سوچ میں ہی جائز اور ناجائز کا بہروپ بدلتی ہے، بھول جاؤ ۔۔ سب کچھ بھول جاؤ ۔۔ جب تم پہلے ہی سے اس بات کو جانتے ہو کہ وہ ایک کھلی کتاب ہے، اور نہ صرف دن کے اجالے میں بلکہ رات کے اندھیرے میں بھی پڑھی جاتی ہے، تو ۔۔ تم نے خواہ مخواہ، اس کو مسئلہ بنائے رکھا۔ تمھیں قبل از وقت ہی فیصلہ کر لینا چاہیے تھا ۔۔ اب بکھر پٹینے رہنے سے کیا فائدہ ۔۔ تم اب

پھر سے اُسی دیوار کو اُٹھاؤ ۔۔۔ اور اُدھیڑے اور گرتے ہوئے پلاسٹر کی مرمت کرا دو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا

نہیں نہیں ۔۔۔ میں چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتا ۔!

کیا تمھارے اندر کی چھپکلیاں اس کی اجازت نہیں دیتیں ۔ نہیں تو، تم اپنے سایہ کی طرح، اس کو پالتے رہو ۔۔۔ تم یوں سمجھو کہ تمھارے نیچے بے حس و حرکت زمین ہے ۔ اور تم بس چلتے رہو، اور ۔۔۔ ایک دن تھک ہار کر سب کچھ بھول جاؤ گے ۔

مگر چھپکلیاں ۔۔۔!

وہ خود بہ خود اپنا راستہ بدل لیں گے ۔

اور کہیں چھپکلیاں ہی سب کچھ بن جائیں تو ؟

انھیں، اپنی دیوار میں چنوا دینے کے بجائے، شہر سے کہیں دور کسی دور کسی غیر آباد علاقہ میں چھوڑ آؤ ۔۔۔ مگر کسی خوش نما اور خوبصورت دیوار کے حوالے مت کرو ۔

تم نہیں جانتے ۔۔۔ تم نہیں جانتے ۔ میں نہ تو دیوار اٹھا سکتا ہوں، اور نہ ہی چھپکلیوں کو غیر آباد علاقہ میں چھوڑ کر آسکتا ہوں ۔۔۔ وہ میرے ساتھ رہیں گی ۔۔ اور ساتھ ہی رہیں گی ۔

تو ایسی صورت میں تمھیں ان کا ہر لمحہ خیال کرنا پڑے گا اور کچھ نہیں کر سکو گے ۔ وہ اچانک میرے سامنے سے اُٹھا اس نے دیوار پر چلنے والی چھپکلی کو پکڑا اور تیز تیز قدموں سے باہر چلا گیا ۔

چلتے ہوئے قدم

"جب روم جل رہا تھا....."

میں اخبار کی اس سرخی کو بغور پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں ایک نو وارد ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس نے ادھر اُدھر پریشان نظروں سے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور ہوٹل والے سے کہا کہ "حمید اچانک مر گیا۔" اس جملے کے سنتے ہی دماغ کی رگیں کلبلانے لگیں اور میرے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا۔ "کیا واقعی میں مر چکا ہوں؟" "نہیں تو کیا پھر میں زندہ ہوں؟ اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں۔ وہ نو وارد تفصیل سنا جا رہا ہے اور ہوٹل کا مالک بڑے ہی کرب سے سن رہا ہے۔ مجھے کچھ ٹوٹے پھوٹے جملے سنائی دے رہے ہیں۔ وہ جوان تھا۔ کبھی کبھی اس محلے میں نظر آتا تھا۔ اپنا دھندہ بھلا اور وہ۔۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ میری گھر کے بازو میرا ہم نام رہتا تھا اسی کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن مجھے موت پر افسوس نہیں ہوتا۔ میں گزشتہ سال ہی افسوس کے احساس کو دفن کر چکا ہوں۔ گزشتہ سال ہمارے گھر ایک موت اچانک ہوئی تھی۔ مرنے والا ۹۵ سالہ بوڑھا تھا لیکن میری زندگی اس کے ہی جسم پر چل رہی تھی۔ ویسے ہر ایک کی زندگی ایک خاص پیریڈ

میں کسی نہ کسی جسم پر چلتی ہے ــــ موت کے وقت کا وہ المناک منظر آج بھی میری نظروں میں گھومتا رہتا ہے۔ جب کبھی میں موت کی خبر سنتا ہوں تو ایسے افسوس کیوں کیا جائے۔ آدمی پیدا ہونا ہی مرنے کے لیے ہے۔ موت تو برحق ہے مر گیا اچھا ہی ہوا۔ تمام جھنجھٹوں سے نجات تو مل گئی اور موت تو ایک ابدی راحت ہے۔

ہمارے اطراف کچھ عجیب اتفاقات آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے کل ہی خود کو خواب میں مرتے ہوئے دیکھا ہے اور آج سچ مچ میرا ہم نام جو میرا ایڈوسی تھا مر گیا۔ کیا خواب بھی جیتے ہیں؟ ــ میں خواب اور حقیقت کو سوچتے ہوئے ہوٹل کے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ بازار کی طرف بڑھنے لگا۔ گلی میں ایک آدھ آدمی گزرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں جب لائٹ کے پول کے پاس پہنچا تو ایک ادھیڑ عمر کا آدمی میرے بازو سے بڑبڑاتا ہوا گزرا۔ وہ کہہ رہا تھا اب آدمی کو اپنا سایہ بھی دھوکہ دینے لگا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ آدمی پھٹی قمیص اور پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ پول کا بلب ہوا کے زور سے کچھ ثانیہ کے لیے خاموش ہوا اور جل اٹھا۔ پھر میرے دماغ میں مختلف خیالات آنے لگے۔ مجھے اس نووارد کا ایک جملہ یاد آیا۔ مرنے والے کی ایک بیوی اور دو چھوٹے بچے بھی ہیں ان تمام سے اب وہ دور چلا گیا۔ ہمیشہ کے لیے "دوری" کے ساتھ جسم میں ایک جھٹکا پیدا ہوا۔ کب تک ایک دوسرے کا ساتھ دیتے کبھی نہ کبھی دور ہونا ہی پڑتا ہے ان خیالات کو بھولنے کے لیے میں نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس نکالی۔ سگریٹ کے دھوئیں میں ان خیالات کو ہوا میں بکھیرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ٹین شیڈ کے نیچے ایک آدمی زور زور سے چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ اور اطراف میں بیٹھے ہوئے لوگ اس کو تسلی دے

رہے ہیں۔ غیر ارادی طور پر میں بھی ان لوگوں کے قریب چلا گیا۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے سگریٹ جلائی۔ میں نے اس روشنی میں اس شخص کا چہرہ دیکھ لیا۔ یہ شخص ہر شام تاڑی پیے رہتا ہے۔ میں بہت دنوں سے اس کی باقاعدگی کو دیکھتا آرہا ہوں۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ شخص کتنی پابندی کے ساتھ اسی وقت تاڑی خانہ سے آکے محلے میں کبھی لوگوں کو گالی گلوچ دیتا ہے اور کبھی ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے۔ آج وہ روتا ہوا کہہ رہا ہے کہ میں لٹ گیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اس رات زلزلے کے ساتھ ہی ہماری بستی ڈوب جاتی تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ میں لٹ گیا۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی نشہ میں سچائی کو پسند کرتا ہے۔ یہ جھوٹ ہے کہ نشہ میں خود کو بھولتا ہے۔ ایسا نہیں۔ آدمی نشہ میں ہی اپنے کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس آدمی کا نشہ محض فراڈ ہے۔ میرا سگریٹ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ میں وہاں سے آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک دم میرے ذہن کی رگیں کلبلانے لگیں۔

پابندی: ہر ایک کے لیے مشکل کام ہے۔ پابندی کے لیے بہت سی چیزوں اور اصولوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ قربانی دینے والا بہت بڑے جگر کا مالک ہوتا ہے۔ پھر میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ذہن کی رگیں اسی رفتار سے کلبلانے لگیں۔ نشہ: یہ تو گناہ ہے ابھی اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ کچھ نوجوان مجھے نظر آئے جن میں سے اکثر میرے کلاس فیلو تھے، میں اس اجتماعی رنگ کو سمجھ گیا۔ یہ تمام تبلیغی جماعت کے ہیں۔ روزانہ اسی طرح مل کر نکلتے ہیں۔ اور کچھ قدموں کے بعد ان کی تعداد میں ایک آدھ کا اضافہ ہو ہی جاتا ہے۔ اب وہ قریب آگئے میں ان کو دیکھ کر رک گیا۔ کہو بھائی کیا حال ہے۔ بڑی محبت سے میرا ایک کلاس فیلو کہتا ہے میں سیدھا سادہ جواب دیتا ہوں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ مجھ سے بہت سی مذہبی باتیں کرتا ہے اور مجھے مسجد میں چلنے کے لیے کہتا ہے۔ میں ان سے جھوٹ کہتا ہوں

وہ چلے جاتے ہیں۔ میں آگے کی طرف نکل پڑتا ہوں۔ سوچنے لگتا ہوں ہم روزانہ کتنے وعدے کرتے ہیں لیکن وقت ان وعدوں کے چہرے مسخ کردیتا ہے۔ کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر کچھ نوجوان مجھے درگاہ کے چبوترے پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اچانک ان میں سے ایک اچھل پڑا اور کہنے لگا کہ سانپ۔ مجھے سانپ کو دیکھنے کی خواہش ہوئی اور جلدی جلدی بڑھنے لگا۔ میرے وہاں پہنچنے تک ایک نوجوان نے سانپ پر ایک بڑا پتھر دے مارا۔ مجھے اس سانپ کو تڑپتے دیکھ کر ایک عجیب احساس ہونے لگا۔ سانپ، بچہ تھا جو بھاگ نہ سکا موت سے بھاگ کر جائے بھی کہاں؟ کوئی راستہ نہیں، نہیں راستے تو جینے دونوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ میں یہاں سے آگے نکل پڑا۔ اچانک میری نظر ایک گھر کے دروازہ پر پڑی۔ دروازے پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا "عبدالرحمان ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ" میں اس بورڈ کو غور سے دیکھنے لگا نام کے ساتھ پوسٹ نہیں لکھی تھی۔ مجھے ہنسی آئی۔ میں یونہی سوچنے لگا کہ کوئی چپراسی ہوگا۔ اگر کسی کو اس کا جائز حق نہ ملے تو وہ کچھ عجیب وغریب حرکتیں کر بیٹھتا ہے۔ میں ویسے ہی آگے بڑھنے لگا۔ پھر مجھے وہ موت اور سانپ کی موت یاد آنے لگی۔ میں خود کو مصروف رکھنے کی خاطر جلدی جلدی قدم بڑھانے لگا۔ اسی اثنا میں طے کر لیا کہ اپنے ایک دوست کے پاس چلا جاؤں اور میرے قدم لاشعوری طور پر دوست کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے اپنے دوست کے مکان پر آواز دی "خورشید" وہ ریڈیو کھولے خبریں سن رہا تھا۔ ریڈیو کی آواز میں میری آواز تحلیل ہو گئی اور میں باہر انتظار کرتا رہا۔ دس منٹ تک کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے ایک اور آواز دے کر چلنے کو سوچ لیا اور چیخ کر آواز دی۔ اب میری آواز ریڈیو کی آواز سے تیز تھی۔ جواب اندر سے آیا۔ میں نے اس کے آنے تک طے کر لیا کہ واپس

چلا جاؤں کیونکہ ریڈیو، مجھے آج تک متاثر نہیں کر سکا۔ میں دوسرے ہی لمحہ لوٹنا چاہتا تھا کہ آواز آئی "کدھر چلے، بہت دنوں کے بعد آئے ہو" میں اب مجبور ہو چکا تھا۔ میرے دوست نے مجھے اندر آنے کے لیے کہا۔ میں اس کے ساتھ ہی اندر چلا گیا کمرہ میں داخل ہوا اور آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ میری نگاہیں اس فریم پر اٹک گئیں، جو میرے مقابل دیوار پر آویزاں تھا۔ میں فریم کی تحریر کو پڑھنے لگا جس میں کلمہ طیبہ درج تھا۔ ابھی میری نگاہیں وہیں جمی تھیں کہ ریڈیو کی آواز نے چونکا دیا۔ آج امریکہ کے سینیٹر کینیڈی کا انتقال ہو گیا۔ پورے امریکہ میں ماتم۔ غیر ممالک سے تعزیتی خطوط کا تانتا۔ میں ایک دم چونک گیا اور میری زبان سے نکلا کہ آج موت کا دن ہے۔؟ موت اور ماتم کتنا بھیانک سنگم ہے۔ بند کر دو ریڈیو ــــ میرا دوست میری کرخت آواز پر چونک گیا، اور خود بخود اس کے ہاتھ ریڈیو کے بٹن پر چلے گئے۔ ریڈیو بند ہو گیا۔

کیوں کیا بات ہے۔

کچھ بھی نہیں۔

اتنے گھبرائے کیوں ہو۔

بس ایسے ہی

افسانے کا موڈ ہے

چھوڑو بھی۔ میرے افسانے تمہیں پسند نہیں آتے۔ تمہیں علاؤالدین والی کہانی اور جاسوسی دنیا پسند آتے ہیں۔

اور نہیں تو کیا وہی باتیں لکھتے ہو جو روز دیکھتے ہیں جن سے ہم پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں کچھ دیر کے لیے بھولنا چاہتے ہیں۔

تو تم الہ دین کی کہانی میں خود کو بھولنا چاہتے ہو، دھوکہ دینا چاہتے ہو۔
تم نے سُنا کر صرف باتوں سے آج تک کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہر ایک
اپنی طاقت کا سکہ جمانا چاہتا ہے۔

تو میں کیا کروں۔

صرف لکھتے ہی رہو گے۔

اور کر بھی کیا سکتا ہوں جس کی طاقت اس کی بات بڑی ہے

سگریٹ پیو گے؟

ضرور، کیوں نہیں، اگر تم زہر بھی..... نہیں..... اچھا اب میں چلتا
ہوں۔

بیٹھو کہاں جاؤ گے۔ بہت دنوں کے بعد آئے ہو کچھ دیر بیٹھو اپنا ایک آدھ
افسانہ سُناؤ۔

میں تمھیں اپنا افسانہ نہیں سُناؤں گا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔

پھر کب ملو گے؟

کبھی بھی، کیوں کوئی ضروری کام ہے کیا؟ ہاں تمھارے مطالبے کو بہت جلد پورا
کروں گا۔

خیر تم جاؤ۔

میں اس کمرے سے نکل کر بازار کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک لڑکا زور زور سے
رہا تھا: "میرے یار شب بخیر" واہ رے دھوکہ میں خواہ مخواہ ہنستا ہوں آدمی
لکھتے دکھاتے دھوکہ میں رہتا ہے دھوکہ: اسی کے سہارے تو جی رہے ہیں۔ صبح
شام ہوتے تک نہ جانے دھوکے ہم پر سوار کہاں کہاں لے جاتے ہیں۔ میں
جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکال ہی رہا تھا کہ صمدانی نے سلام کیا۔ میں سلام

کا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ صمدانی نے اپنی عادت کے مطابق مجھے رد کا اور بستر سے اٹھنے سے لے کر اب تک کی تفصیل سُناتا رہا اور میں مسلسل بور ہونے لگا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسی باتیں جن سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہوتی انہیں بغیر کسی احساس کے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ میں اس کی باتیں خاموشی سے سُنتا رہا۔ صمدانی ویسے ہمیشہ اپنے ہاتھ میں کسی نہ کسی قسم کا پھول رکھتا ہے اور ہر مرتبہ مجھے پھول لینے کے لیے کہتا ہے۔ مگر مجھے پھول سے کوئی دلچسپی نہیں اس لیے ہر بار انکار کرتا ہوں۔ آج بھی وہ معمول کے مطابق اپنے ہاتھ میں گلاب کا پھول لیے ہوئے تھا اور مجھے لینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں فوراً غصہ میں آگیا۔ میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔

مجھے اس پھول سے نفرت ہے۔ میں تمہیں ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں۔ صمدانی میری اس حالت پر بوکھلا گیا۔ میرا ایک ذاتی کامپلکس ہے کہ میں لال چیز سے گھبراتا ہوں۔ کیونکہ لال چیز دہشت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ میں صمدانی سے ہاتھ ملائے بغیر آگے کی طرف چل پڑا۔

میرے قدموں کے نشان جاگتی سڑک پر تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔ لوگوں کا ہجوم پھیلتا جا رہا ہے۔ دوکانوں میں روشنی جل رہی ہے۔ پھیلے ہوئے ہجوم میں میری نظر اس لڑکی پر پڑی جو میری کلاس فیلو تھی۔ لیکن آج وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہنستے ہوئے جا رہی ہے۔ اس نے مجھے ایک نظر دیکھا۔ میری تو نظر اسی پر تھی۔ اس کی نگاہیں فوراً نیچی ہو گئیں۔ غالباً اسے کالج کا وہ واقعہ یاد آیا ہو۔ اس وقت وہ کافی پریشان ہوئی تھی۔ اور میں نے اس کی پریشانی کو دور کیا تھا۔ خیر چھوڑو۔ میں خود سے کہتا ہوں میرے قدم برابر بڑھ رہے ہیں۔ ایک جگہ ہجوم نظر آرہا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر ایک سیاسی لیڈر ملک کی سالمیت اور ترقی کی باتیں کر رہا ہے اور ساتھ ہی تفریق انتشار کی ترغیب بھی دے رہا ہے۔ میں کچھ دیر وہاں ٹھہرا اور تقریر غالباً سنتا رہا۔

مجھے فیصلہ دینے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ شخص محض اپنے مفاد کے لیے اتنے بڑے ہجوم کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ ہجوم جو شعوری بیداری سے کئی میل دور ہے۔ وہ ان سب کے بھولے پن سے اچھی طرح واقف ہے اور مسلسل گرجتا جا رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ منھ سے جھاگ نکلے گا اور بہے گا۔ وہیں وہ دھوبی بھی ہے۔ جسے میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ جس کی حرکات کچھ عجیب ہوتی ہیں۔ ہمیشہ یہ دھوبی عورت کی باتیں کرتا ہے اور اس کی باتوں میں کچھ انوکھے انکشافات ہوتے ہیں۔ بیچ سڑک پر چلتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ بیچ سڑک پر چلنا خطرناک ہے مجھے مشینی موت پسند نہیں میں فوراً اس خیال کے ساتھ فٹ پاتھ پر آگیا۔ چلتے چلتے میں شہر کے چوراہے پر آگیا اور اچانک بتی کا کرنٹ فیل ہوگیا۔ میں نے ماچس جلائی لیکن ہوا کے سامنے ماچس خاموش ہوگئی۔ اس خاموش اندھیرے میں ایک چیخ سنائی دی اور میں گھبرا گیا اور میرے پیر لڑکھڑا گئے۔ زبان سے بے ساختہ نکلا کہ موت شاید مشیت کا ایک اٹل فیصلہ ہے۔

— —

رابطہ

گرمی شدید تھی۔ میں رکشہ سے اُترا اور سیدھے بس اسٹینڈ پہنچا۔ کنڈکٹر سے ٹکٹ لے کر بس کے اندر داخل ہوا۔ بس میں مسافر اِدھر اُدھر سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بس خالی ہو تو مسافر اپنی اپنی من پسند سیٹوں پر بیٹھتے ہیں۔ مجھے کھڑکی کے پاس جگہ ملی۔ کنڈکٹر وقت پر آئے اور بس مقررہ وقت پر اپنا اسٹاپ چھوڑ دے۔ یہ تو ناممکنات میں سے ہے۔ ہم سب مسافر کنڈکٹر کی راہ دیکھ رہے تھے۔ کچھ مسافر بے چین بھی ہو رہے تھے۔ ممکن ہے کہ انھیں اپنی اپنی منزل پر جلد پہنچنا ہو مگر مجھے ایسی کوئی عجلت نہیں تھی۔ میری نظر ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر پڑی۔ ایک بے حد خوبصورت عورت اپنے بچّے کو ساڑی کے پلّو کی آڑ میں دودھ پلا رہی تھی اور اس کے بازو والی سیٹ پر ایک دیہاتی منھ میں پان دبائے عورت کو چور نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

کنڈکٹر ابھی نہیں آیا — میں اپنی بریف کیس سے "گرتے ہوئے درخت" نکال کر پڑھنے لگا:

"مجھے شیلا یاد آئی جو میرے کمرے کے سامنے کمرہ نمبر ۹ میں رہتی ہے۔ اس کے گھر والے اُسے پیار سے شیلو پکارتے ہیں۔ میرا بھی

جی اُسے اُسی نام سے پکارنے کو چاہتا ہے۔ لیکن میں اس لبادے میں منہ چھپا لیتا ہوں وہ صبح شام انگیٹھی سلگانے کے لیے باہر گلی میں رکھ دیتی ہے جس کا کڑوا دھواں صندی بچے کی طرح میرے کمرے میں گھستا چلا آتا ہے۔ پہلے پہل میں نے سوچا تھا کہ یہ بھی پیار کا ایک انداز ہوگا لیکن جب کئی دن گزر گئے تو مجھے یقین آگیا کہ وہ صرف انگیٹھی سلگاتی ہے پیار نہیں کرتی ویسے بھی اس طبقہ میں پیار ویار نہیں کیا جاتا۔ انگیٹھی سلگائی جاتی ہے۔ کپڑے دھوئے جاتے ہیں کھانا پکایا جاتا ہے اور شادی کی جاتی ہے۔ جب وہ رسی پر سے کپڑے اتارتی ہے، اپنی کسی سہیلی سے باتیں کرتی ہے یا چٹخارہ بھر کر گول گپے کھاتی ہے تو میں اپنے لبادہ میں چھپا اسے دیکھ لیتا ہوں۔!

اور سوچتا ہوں کہ میں ضرور شیلو سے عشق کرنے لگا ہوں۔ جن دنوں یہ موڈ شدید ہوتا ہے۔ میں شیو نہیں بناتا۔ نہاتا بھی نہیں بال بکھرا لیتا ہوں۔ سگریٹ پھونک پھونک کر انگلیاں پیلی کر لیتا ہوں۔ لیکن شیلو پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کے معمول میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ چاٹ کھاتی ہے پڑوس کی شانتی سے کھسر پھسر کرتی ہے اور ریڈیو سیلون سے فلمی گیت سنتی ہے۔ تنگ آکر میں سوچتا ہوں کہ اس قسم کا عشق تو میں ملکہ الزبتھ سے لے کر کلو دھوبن تک کسی سے بھی کر سکتا ہوں۔"

گھنٹی بجی — میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ کنڈکٹر بس میں آچکا ہے اور کہہ رہا ہے "اور کسی کو ٹکٹ لینا ہے؟ جلدی کر دے۔" وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پنچ سے ٹخ ٹخ آوازیں کرنے لگا۔ میری نظریں پھر اس بچہ والی عورت

کی طرف اُٹھیں۔ اب خوبصورت عورت کے مقابل بدصورت مرد براجمان ہے۔ مجھے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ میرا ایک بچپن کا ساتھی منظفر کہتا تھا کہ "خوبصورت چیزوں کا ارمان دل میں پیدا نہ کرو ورنہ زندگی بھر جہنمی عذاب کو برداشت کرنا پڑے گا، ہر خوبصورت چیز کا مقدر بدصورتی سے ٹکراؤ اور تصادم ہوتا ہے۔"

بچہ ٹھمک کر پپا پپا کہہ رہا تھا۔ اور باپ کی گود میں جانے کے لیے ہاتھ پھیلا رہا تھا۔ کالا کلوٹا کہیں کا۔

بس اپنا اسٹینڈ چھوڑ چکی تھی۔ اب ہم سوکھے کھیتوں، تر تحتی زمین اور اونچے اونچے پہاڑوں کو فلم کی ریل کی طرح گزرتے دیکھ رہے تھے۔ میری کھڑکی سے دھوپ اندر آرہی تھی۔ میری نظریں کتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ "میں نے اس کی طرف دھیان سے دیکھا۔ ایسا لگا لڑکی نہیں ریڈیو سیلون بول رہا ہے۔ میں نے سوچا یہ کیسی لڑکی ہے۔ اسے پتہ ہی نہیں محبت کسے کہتے ہیں۔ دو دلوں کا ملاپ کیا ہوتا ہے۔ ان گھروں میں لڑکیوں کو یہی سکھایا جاتا ہے کہ محبت ایک خطرناک چیز ہے۔ مجھے چھلو کا خیال آیا۔ کتنی عظیم عورت ہے۔ نہ انگیٹھی سلگاتی ہے نہ کلب جاتی ہے اس کے ہاں محبت جسمانی ہوس کا نام ہے اور شیلی کے اسکائی لارک میں اسے فینٹسی کہتے ہیں یا افیئر۔"

"شیلو کو میں نے HOUSE OF FIRE پر ایسے لکھوایا۔ شیلی نے MY BEST FRIEND پر لکھ لیا جس میں اس نے صرف اپنے کتے ٹائیگر کا ذکر کیا ہے۔ چھلو کبھی سلام کرتی ہے۔ کبھی آنکھ مارتی ہے۔ میں کھانستا ہوں۔"

(کھانسی اور لڑکی - شردن کمار ورما)

بس ایک جھٹکے کے ساتھ ایک چھوٹے سے بس اسٹاپ پر رک گئی۔
میں نے سگریٹ سلگایا۔ کتاب رکھ دی اور باہر دیکھنے لگا۔
"انگور میٹھے ہیں بابو جی ۔" ایک بوڑھے انگور بیچنے والے نے کہا۔
میں خاموش رہا۔ اس وقت تو میٹھے انگور بھی کھٹے لگتے ہیں ۔
اب شاید نسرین کے بھی پاؤ درجن بچے ہو گئے ہوں گے۔ اور وہ چولھے
چکی میں لگی رہتی ہو گی۔ اس کے علاوہ اپنے اور اپنے شوہر اور بچوں کے کپڑے
دھوتی ہو گی، اس کے سوا اور کام ہی کیا ہو گا،
وہ رات کی انگلیوں پر سوار ہو کر آئی تھی۔ اور کہنے لگی تھی کہ
"لے لو اب میں تمھاری ہو گئی ہوں ۔"
میں نے اسی وقت کہا تھا کہ یہ تمھارا جذباتی انداز ہے۔ اس نے کہا
تھا کہ
"تم سوچتے بہت ہو ۔ اور یہ طریقہ مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔"
"ہاں تم جذباتی ہو کر بولتی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارا پہلا جملہ کس لیے
ہے اور دوسرے جملے کا تعلق پہلے والے سے کیا ہوتا ہے۔" میں نے کہا تھا۔
"میں چلی جاؤں گی ۔ پھر کبھی نہیں آؤں گی۔ سمجھے ۔"
نسرین نے کہا تھا۔
"ٹھیک ہے آنے اور جانے پر کس کی پابندی ہے۔" میں نے کہا تھا۔
"افلاطون کہیں کا۔" نسرین نے غصہ سے کہا تھا۔
میں صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔
ٹکٹ، ٹکٹ، بس کی گھنٹی بجی۔ اور بس چل پڑی۔ میری نظریں

باہر کا منظر دیکھ رہی تھیں اور اب اندر کے ماحول کا جائزہ لینے لگیں۔ پھر میں نے سامنے والی سیٹ کو دیکھا اب وہاں ایک دیہاتن آ کر بیٹھی تھی۔ میں دھوپ کے باوجود کھڑکی سے باہر جنگل میں لڑتی ہوئی گائے اور بھینس کو دیکھنے لگا۔ بس کی رفتار میں تیزی آ چکی تھی۔ میرے بال ہوا سے اُڑ رہے تھے اور سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں نے بریف کیس سے کاپی نکالی اور دور ہٹ کر بیٹھا — اور .....

یہ ہوا کہاں سے آتی ہے
روز روز ہی آتی ہے
اور یہ کہتی ہے کہ یوں

چلو چلیں اب یہاں سے ہم
دور کہیں اک درخت کے نیچے
تم اور میں مل کر بیٹھیں گے
یہ ہوا بھی کیسی عجیب ہے
مل بیٹھے گی
اور اڑا لے جائے گی
مجھ کو تنہا چھوڑ کر آئے گی
اور کہے گی
یہیں رہو تم
خود تنہا ہنستے ہنستے اُڑ جائے گی
شاید اس کی بھی کوئی زمین ہو گی

ہوا تیز تھی ۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ بند کر دیا اور بریف کیس میں جو میری گودی میں تھا ۔ کاپی رکھ دی اور ایک مجموعۂ کلام نکالا اور اس کے اوراق اِدھر اُدھر سے دیکھنے لگا ۔

پت جھڑ ایک اننت ٹوٹن ہے
سب سچ ہے
سب جھوٹ ہے
تنہائی یونگ ہے
دونوں کی ایک بیچ سطر خالی ہے
ہم کو تو معلوم نہیں ہے
سَطر
سدھار تھ ہوا پانی کا برتن
پھر تیر تھ ستھان کا اندر بن جاتی ہے
موسم بیتے ⎫ موسم آئے
موسم بکھرائے ⎬
موسم پھرائے ⎭ موسم پھر بیتے
دھوپ سویرا شام برف
راتیں گرمی اور برساتیں
رنج خوشی اور غصہ لائیں
ی ع ن ی
برس ٹوٹتے ہیں
یعنی
برس جڑ جاتے ہیں

لیکن پت جھڑ
ایک اننت ٹوٹن ہے

(صلاح الدین پرویز)

"جنگل" میرے ہاتھ میں ہے۔ اور پت جھڑ کی آواز میرے کانوں میں تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور یادوں کے جزیرہ میں ایک ناتمام سلسلہ ہائے زیست کو دیکھتا رہا۔ میرا سر سیٹ پر ٹکا ہوا ہے۔ بس کی گھڑگھڑاہٹ سماعت کے پردوں پر اذیت ناک بنی جارہی تھی۔ میں نے اپنے ذہن کو جھٹک دیا۔ اور آنکھیں ملتے ہوئے سیدھا بیٹھا۔ بس میں مسافر اب کم ہو چلے تھے۔ میری بازو دوسری رو میں ایک خوش پوش اور خوبرو نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ نوجوان مجھے بار بار دیکھ رہا ہے۔ شاید میری حالتِ زار پر افسوس کررہا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا پیر بار بار نیچے رکھے ہوئے سوٹ کیس پر ادھر سے اُدھر ہو رہا ہے اور وہ کبھی کبھی سوٹ کیس کے ہینڈل کو ذرا مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔

"آپ بہت دیر سے بے چین نظر آرہے ہیں" نوجوان نے پوچھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"جہاں سے آپ بس میں سوار ہوئے ہیں وہیں سے میں آپ کو دیکھ رہا ہوں کیا آپ کو جلدی پہنچنا ہے؟" نوجوان نے پوچھا۔

نہیں کوئی عجلت نہیں۔" میں نے کہا۔

میں برابر دیکھ رہا ہوں کہ نوجوان کا ہاتھ سوٹ کیس کے ہینڈل پر مضبوطی سے جما ہوا ہے۔

"یہاں سے شام پور کتنی دور ہے؟" نوجوان نے پوچھا۔

"بس دن نگر کے بعد شام پور ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"اور کتنی دیر لگے گی۔" نوجوان نے پوچھا۔

"دن نگر ابھی ایک گھنٹہ میں آئے گا اور اس کے بعد شام پور ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" نوجوان نے پوچھا۔

"میں شام پور جا رہا ہوں۔" "آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں سحر پور سے آ رہا ہوں۔ شام نگر میں تھوڑی دیر کام ہے بس ایک گھنٹہ کا۔" نوجوان نے کہا۔

"بہر حال کام ہے۔ وہ کتنی ہی دیر کا کیوں نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"آپ شام پور میں کس کے پاس جا رہے ہیں؟" نوجوان نے پوچھا۔

"میں شام پور میں اپنے ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کوئی سرکاری کام ہے وہاں، آپ کا؟" نوجوان نے پوچھا۔

"سرکاری کام! نہیں نہیں دوست سے ملے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ بس دوست سے مل کر کل واپس چلا آؤں گا۔" میں نے کہا۔

نوجوان نے سوٹ کیس کو ہاتھ سے چھوڑ کر پیروں سے دوسری سیٹ کے نیچے ڈھکیل دیا۔

"ابھی کسی بس اسٹینڈ پر اُتر کر چائے پی لیں گے سر میں درد ہو

رہا ہے۔" نوجوان نے کہا۔

"نہیں، کچھ ہی دیر میں، ہم شام پور پہنچ جائیں گے۔ شام پور میں آپ کا کیا کام ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بس ایک صاحب سے مل لینا ہے۔" نوجوان نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ آپ سرکاری ملازم ہیں۔" نوجوان نے کہا۔

"آپ نے مجھ میں ایسی کون سی بات دیکھی، کیا سرکاری اور غیر سرکاری ہماری پیشانیوں پر لکھا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بس یونہی گمان گزرا۔" نوجوان نے کہا۔

سامنے سے ایک جیپ آتی ہوئی نظر آئی۔ بس ڈرائیور نے جیپ کو راستہ دینے کے لیے بس کو تھوڑا سا سڑک کے کنارے لے لیا۔ نوجوان کے چہرے پر پسینہ آرہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جیپ کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بس اور جیپ کے بیچ تصادم ہوگا۔ اس کی گھبراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ جیپ تیزی سے آگے نکل گئی۔ نوجوان نے اپنی دستی سے چہرے کا پسینہ صاف کرلیا اور جیب سے ۵۵۵ سگریٹ کی ڈبی نکال کر میری طرف بڑھائی لیکن میں نے انکار کیا۔ پھر اس نے زبردستی کی۔ مجبوراً میں نے اس سے سگریٹ لے لی۔ ہماری بس ٹھیک وقت پر شام پور اسٹیشن پہنچ گئی۔ میں نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور نوجوان نے اپنا سوٹ کیس اٹھالیا۔ مجھے لگا کہ اس کا سوٹ کیس کافی وزنی ہو۔ بس سے نیچے اُترنے کے بعد نوجوان ایک رکشہ کی طرف بڑھا اور ٹاٹا کہتا ہوا چلا گیا۔

میں دوسرے دن صبح اٹھا اور اخبار دیکھا مجھے پہلے یقین ہی نہیں آیا۔ کیا یہ سچ ہے؟ اخبار میں اسی نوجوان کا فوٹو تھا۔ پولس نے کل رات ہی اسی نوجوان کو گرفتار کر لیا تھا۔ میرے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا۔ میرے ذہن میں رات والی نظم گھومنے لگی۔

پہرہ داروں کی آٹھوں پہر
پہرگی اس قدر سخت تھی
شوخ بچّوں کی ساری شرارت دھری رہ گئی
نہ شاخوں پہ جھولے کی رسّی کے چرکے پڑے
نہ انجانے پیروں کی انجانی آہٹ سے رستے جگے
نہ۔ خوف سے ہلکے احساس سے "اڑنے والے پرندوں نے پر پھڑپھڑائے
ننھّے ہاتھوں سے صحن چمن میں نہ پتھر کی بارش ہوئی
نہ پتّوں کو چوما، غلیلوں سے نکلے ہوئے کنکروں نے
بور آئے
مگر۔۔۔ پی کہاں کی صدا میں عجیب سوز تھا
کوک میں کوئیلوں کی، اداسی کے لیے تیز تھی
پہرہ داروں کی آٹھوں پہر
پہرگی اس قدر سخت تھی
شوخ بچّوں کی ساری شرارتیں دھری رہ گئیں
بادیاراں کی کوتاہ دستی کے
سارا بھرم کھل گیا
سب درختوں کے پھل بچ گئے (نظم۔ شمیم انور)

--

شکن در شکن

"مقدر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ بیٹا۔"

"کیا ہوا ماں" کیا بات ہے۔ تم آج مقدر کے بارے میں سوچ رہی ہو۔"

"بس یونہی خیال آیا بیٹا۔ اب میرا کیا ہے۔ ایک پیر زمین پر اور ایک پیر قبر میں۔ آنے والوں کا کیا ہو گا بیٹا؟"

"آنے والوں کا تم مت سوچو۔ جو ہو گا وہی اس کو بھگت لیں گے تم کیوں فکر مند ہو ماں۔"

"کون کس کی فکر کرتا ہے بیٹا۔ ہم اپنی اپنی فکروں کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ زمانہ کا رنگ ہی الگ ہے کوئی بات سر پیر کی نہیں ہوتی ہر بات اکھڑی اکھڑی لگتی ہے۔ بازو کے مکان میں ساجدہ ہے نا! کہہ رہی تھی۔ اب وہ اکیلی شہر جائے گی اور وہیں اکیلی رہے گی۔ پتہ نہیں بٹیا وہاں کیسے کیسے لوگ ملیں گے۔ یہ سوچ کر ہی میرا دل" ڈوبا جا رہا ہے۔"

"دیکھو ماں ساجدہ اب بچی نہیں رہی۔ وہ اپنا بھلا برا خوب جانتی ہے اس کی چنتا کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

"پھر بھی بیٹا جوان لڑکی ہے۔ موئے چھوکرے اس کی طرف آنکھیں لگا کر اس کے گورے گورے پیارے چہرہ کو نظر نہ لگا دیں۔ پھر بھی مقدّر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ خدا کو جو منظور ہے وہی ہوگا۔"

"ماں! تم ابھی تک اپنے فرسودہ اور پامال خیالات کو ہی پالے جا رہی ہو اب ایسا نہیں ہے کہ لڑکی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھے، وہ خود اپنی حفاظت کر سکتی ہے۔ اور ماں چہرے کو کوئی نہیں دیکھتا۔ کاش! امّاں تم سب کچھ سمجھ سکتیں۔ ماں پھر مقدر و قدر کی کیا بات کرتی ہو۔ یہ بھی کوئی چیز ہے سب بے کار کی باتیں ہیں تم خوا مخواہ سوچ رہی ہو۔ مقدر کیا چیز ہے۔ (ساجدہ جائے گی۔ اور ایک وسیع خلا میں کہیں دور کھو جاؤں گا۔)

"نہیں بیٹے خدا سے ڈرو۔ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔"

"ماں ہم سب جیسا کرتے ہیں ویسا ہی ہم کو اس کا صلہ ملتا ہے۔ کیا خدا اتنی اتنی باتوں پر ناراض ہوتا ہے وہ بھی الگ الگ صورتوں میں۔ ہم سب کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اور اگر ہم اس کی عطا کی ہوئی صورتوں میں علاحدہ ہونے لگتے ہیں تو وہ دکھی ہوتا ہے۔"

"نہیں بیٹا ایسا نہیں کہا کرتے۔ وہ غصہ ہو جائے گا نا، قیامت آجائے گی۔ تم جو دل میں آئے کہہ دیتے ہو تمھاری ایسی حرکتیں اور عادتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

"ماں! میں تمھاری بات مان لیتا ہوں میرے لیے تمھاری حکم عدولی ممکن نہیں پھر کسی اور پر غصہ نہیں کر سکتا۔ کوئی تو ہو جس پر خوب جی بھر کر غصہ اتارا جائے۔ کم از کم ہم اپنے آپ پر غصہ اتار لیں کچھ دیر کے لیے خود میں رونما ہونے والے حادثات کو واقعات کو بھول جائیں تم فکر مند نہ ہو ماں۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ تم مقدر کے لکھے کو سب کچھ سمجھتی ہو۔ لیکن کب تک ماں" (ساجدہ شاید شہر جانے کی تیاری

کر رہی ہوگی۔ کیا وہ بھی میری طرح سوچ رہی ہوگی۔؟)

"نہیں بیٹا صبر کرو۔ صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ میں اس لیے کہتی ہوں کہ خدا کی مہربانیوں سے غافل نہ رہو۔ تمہاری ان باتوں میں خدا سے بغاوت کی بُو آ رہی ہے۔ توبہ کرو بیٹا۔ توبہ۔ کل اسی خدا کو منھ دکھانا ہے۔ وہ جلائے گا۔ وہ سانپوں سے کٹوائے گا۔ صبر کرو۔ سب کچھ مل جائے گا۔ دیکھو میں نے نظام سرکار کے زمانہ کو اپنی انھیں آنکھوں سے دیکھا ہے اور اب لوگ شاہی دیکھ رہے ہیں کیا کیا نہیں دیکھا میری ان آنکھوں نے کیا کیا نہیں سُنا، ان کانوں نے کیا زمانہ تھا وہ بھی اور کیا زمانہ ہے یہ بھی! بیٹا یہ سب وقت وقت کی بات ہے۔ میں تمہاری عمر میں تھی تو چپ چپ اپنے بزرگوں کی باتیں سُنا کرتی تھی۔ ایک بات بھی ان کے خلاف نہیں کہتی تھی۔ میں یہی سمجھتی تھی کہ ان کی تجربہ کار آنکھوں اور ذہن نے جو کچھ دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے پرکھا ہے اور جانچا ہے وہ اسے اپنے چھوٹوں کو دے رہے ہیں۔"

"ماں۔ تم نے سچ کہا ہر آنے والی نسل اپنی پچھلی نسل سے بہت کچھ سیکھ لیتی ہے۔ یوں سمجھو کہ ان کی ہڈیوں اور ان کے گوشت سے خون اور پانی نچوڑ لیتی ہے، لیکن ماں لکیر کے فقیر بنے رہنا بھی ٹھیک نہیں تم سمجھتی نہیں ہو کہ میں سب غلط کہہ رہا ہوں ماں تم درحقیقت اپنی باتوں کو اہم سمجھ رہی ہو اور سوچ رہی ہو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اختلاف برائے اختلاف ہے نہیں مجھے تم سے کوئی عداوت نہیں اور نہ میں تم کو اپنی کوئی رکاوٹ سمجھتا ہوں ہر عہد، ہر نسل اپنے اپنے مسائل کا حل پیدا کر لیتی ہے۔ وہ اپنے اچھے اور بُرے سے بخوبی واقف رہتی ہے۔"

"تم سچ کہہ رہے ہو بیٹا۔"

"ماں مجھے لگتا ہے کہ آدمی جہانِ آب و گل میں کرب سہنے کے لیے اکیلا چلا آتا

ہے۔ وہ کسی بھی شکل میں کیوں نہ ہو۔ بظاہر ہر خوشحال آدمی بھی غیر متوقع کرب برداشت کر لیتا ہے۔ (ساجدہ شہر جانے کی خوشی میں مجھے بھول تو نہیں گئی ہوگی اور اگر ایسا ہوا تو ــــ!؟) تم مقدر کو سب کچھ سمجھتی ہو اور زمانہ دانش مندی اور عقل و فراست کو ذرا سا عقل نے نیرنگی طبیعت کا ساتھ دیا اور دھڑام سے جال میں پھنس گئی (میری ہی بد دماغی ساجدہ سے دوری کا باعث بن گئی۔؟) اب تم کہو گی کہ عقل بھی اسی وقت کنٹرول میں آسکتی ہے جب اس کا توازن و تناسب نہ بگڑے۔ لیکن اس کا کون سا پیمانہ ہے۔ ہم اپنے اپنے طور پر پیمانہ بنا لیتے ہیں۔ لگتا ہے کہ سچوایشن کا استحصال اور وقت کا تقاضہ ہی اہم ہے"۔

"بٹیا میں یہ نہیں جانتی کہ وقت کب اور کیوں کر ہمیں اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیتا ہے۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ مقدر ہی اصل ہے۔ تم اس کے لیے ڈھیر سارے الفاظ استعمال کر سکتے ہو۔ میں اس لیے کہتی ہوں کہ نوجوان لڑکیوں کو اکیلے وہ بھی پردیس میں، نہیں رہنا چاہیے۔ ساجدہ وہاں جا کر کیا کرے گی۔ تم یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ یہ چیونٹیاں دیکھ رہے ہو نا ــ یہاں کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن یہ جب بھی میٹھی چیز کی بُو سونگھ لیتی ہیں۔ دوڑی دوڑی چلی آتی ہیں میں اس سے کہہ رہی ہوں کہ جان جوان لڑکی اور وہ بھی پرائے دیس میں ــ"۔

"ارے ماں، تم ابھی تک وہی بات سوچ رہی ہو ــ تمھارے دماغ میں اور کوئی بات آتی ہی نہیں (شاید اب وہ بالکل تیار ہو چکی ہوگی۔ کیا مجھے ساجدہ سے مل لینا چاہیے۔ اگر وہ ملنے سے انکار کر دے تو وہ ــ؟)

"اگر تمھیں میری باتیں اچھی نہیں لگ رہی ہیں تو تم مجھ سے کچھ کہو گی ــ نہیں ماں، تم بُرا مان گئیں میں تمھاری باتوں کو درگذر نہیں کر سکتا دوسری باتوں کی طرف بھی دھیان دلا رہا تھا"۔

"دوسری اور باتوں میں کیا رکھا ہوا ہے - کیا تم اس وقت ساجدہ کو روک نہیں سکتے "

"میں، ہرگز نہیں میری بات کیوں مانے گی " (کیا ماں میرے اور ساجدہ کے تعلقات کا علم رکھتی ہے -) .... تم ساجدہ کے اکیلے شہر جانے پر مقدر کو یاد کر کے اپنے نزدیک مسئلہ پیدا کر رہی ہو - تم اس کے ایک ہی پہلو پر غور کر رہی ہو - صرف اس کے گوٹے گوٹے پیارے پیارے چہرے پر نظر لگ جانے کے خدشہ میں خوف کھا رہی ہو، تم سمجھتی ہو کہ یہ عمل صرف شہر میں ہی ہوتا ہے - پتہ نہیں یہاں اس کا چہرہ کتنی بار نظر لگنے کی وجہ سے سیاہ اور زرد ہوا ہو گا - اور اس کی تمہیں کانوں کان خبر نہیں ہوتی " (ساجدہ نے کسی بھی وعدہ کو پورا نہیں کیا - کیا وہ میرے پاس صرف وقت گزاری کے لیے آئی تھی - کاش میں نے پہلے ہی جان لیا ہوتا - !)

"غلط - تم ایسا سمجھ سکتے ہو - مگر میں کبھی ایسا نہیں سوچ سکتی - میں یہاں کے ایک ایک شخص کو جانتی ہوں —"

"تم اپنی ہی بات کو درست سمجھ رہی ہو "

"دیکھو بارش ہو رہی ہے - باہر تار پر لٹکے ہوئے کپڑے اندر لے آؤ کہیں بھیگ نہ جائیں —— کہیں تم ایسا تصور نہیں کر رہے ہو کہ پانی میں کپڑے نہیں بھیگتے - اور دھوپ میں بھیگتے ہیں تم ایک ہی شے کے بہت سے پہلوؤں پر غور کرتے ہو"

"ایسا نہیں ہے ماں - ابھی تمہارا حکم بجا لاتا ہوں - پھر بات کرتا ہوں "

"ہاں ہاں کپڑے لے آؤ —— کیا بارش تیز ہو گئی ؟

"یہ لو تمہارے کپڑے ...... ہاں میں کہہ رہا تھا کہ تم میری بات کا مذاق اُڑا رہی ہو ...... دھوپ میں کپڑے سوکھتے ہیں اور بارش میں بھیگتے ہیں اس

میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔"

"میں بھی یہی کہنا چاہ رہی تھی ۔ ساجدہ بہار ہے ۔ جہاں گُل ہوتے ہیں ۔ وہاں گلچیں بھی چلے آتے ہیں ۔ تمھاری شمیم آنٹی جب یہاں سے شہر چلی گئی تھیں، وہ اس وقت بہار تھی لیکن بہت جلد گلچیں نے خزاں سے رشتہ پیدا کروا دیا تھا ۔ کیا تم اب بھی نہیں مانو گے کہ مقدّر کا لکھا مٹایا نہیں جاتا۔"

"میں پھر یہی کہوں گا کہ ہماری انجانی لغزش اور بے عملی ہمارے لیے بعض اوقات جان لیوا ثابت ہوتی ہے ۔ تم غور کرو ماں ۔"

"میں نے بہت غور کیا ہے ۔ میرے بیٹے بہت غور کیا ہے ..... شمیم، تم نے جلد بازی سے کام لیا ۔ شمیم میری شمیم ۔"

"ارے چھوڑو ماں ۔ جو بیت گیا ..... سو بیت گیا۔"

"ایسا تم کہہ سکتے ہو ۔ تم چھوٹے تھے نا ۔ تم نے شمیم کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھا ۔ شمیم میری شمیم ..... میرے بیٹے، کچھ گزری باتیں ۔ کچھ حادثے ۔ کچھ واقعات ...... باوجود کوشش کے بھلائے نہیں جاتے .... میں تو یہی کہوں گی بیٹے کہ مقدّر کا لکھا مٹایا نہیں جاتا۔"

ماں اور بیٹے ایک دوسرے کو ٹک ٹک دیکھ رہے ہیں اور باہر موسلا دھار بارش کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے ۔

— —

اِدھر اُدھر

اُس کی ٹیبل پر کاغذات بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ کچھ کتابیں کھلی ہوئی تھیں اور کچھ اِدھر اُدھر رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے سر کے اوپر ٹیوب لائٹ اپنی زندگی جی رہا تھا۔ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کے لیے زندگی کے انکشافات کرنے میں مدد دے رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا تحریر کر رہا تھا۔ لکھتے لکھتے اس نے بائیں ہاتھ کی طرف رکھے ہوئے دودھ کے گلاس کی طرف اپنا بایاں ہاتھ بڑھایا۔ گلاس ہاتھ میں نہیں آیا بلکہ ٹیبل پر سے نیچے زمین پر گر گیا اور اس کے ٹکڑے زمین پر پھیل گئے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر نیچے گلاس کے ٹکڑے اور کرچیاں ڈھونڈنے لگا۔ پنکھا اپنی رفتار سے گھوم رہا تھا۔ چونکہ اس کی پشت پنکھے کی طرف تھی۔ ٹیبل پر رکھے ہوئے کاغذات محفوظ تھے۔ جب وہ کرسی پر سے اُٹھا تو کاغذات پنکھے کی ہوا سے اِدھر اُدھر سارے کمرہ میں پھیل گئے۔ اس نے گلاس کے ٹکڑے کھڑکی سے باہر گلی میں پھینک دیے۔ اور دودھ سے بھرے ہوئے فرش کو کپڑے سے صاف کر کے پھر سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

پتہ نہیں آج کیوں اُس نے اپنے روزانہ ملنے والے دوست سے روکھے پھیکے انداز میں بات کی تھی۔ روزانہ ملنے والے دوست نے اس کے رویّہ سے یہ نتیجہ

نکال لیا تھا کہ وہ ان دنوں بہت مصروف ہو گیا ہے یا اپنی گھریلو زندگی کے بہت سے معاملات سے ذہنی انتشار کا شکار ہو گیا ہے۔ دوست نے زیادہ باتیں کرنا ضروری نہیں سمجھا اور جلد ہی اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے اس نے سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس اٹھالی اور اس کی نظریں سامنے دیوار پر لگے ہوئے عمر خیام کی رباعی کی تشریح لیے ہوئے کیلنڈر کی طرف اٹھیں۔ ٹھیک ہے کہہ کر وہ تاریخ دیکھنے لگا۔ بارہ تاریخ کو یہاں سے جانا ہو گا۔ سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے اس نے کرسی سے پشت لگا دی اور پھر آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔

"سب کچھ لمحوں میں بدلتا ہے اور لمحوں ہی میں سنورتا ہے۔ کوئی کب تک جتن کر کے اس کے حوالے کرتا رہے گا"

سگریٹ کا ایک اور گہرا کش لے کر اس نے پین ہاتھ میں اٹھا لیا۔ پین بہت دیر سے کھلا پڑا ہوا تھا اور پنکھا بھی چل رہا تھا۔ پین کی نب پر انک سوکھ گئی تھی۔ کچھ لکھا نہیں گیا۔ شاید تنہائی تھی کہ بیزاری اس نے پین کو جھٹک کر لکھنے کی کوشش نہیں کی۔

کیوں اس نے اچانک روتے ہوئے کہا تھا کہ تم میری طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ مجھے تمہارے پاس آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا ہے۔ ہر وقت کام کام کی رٹ لگائے رہتے ہو۔ آخر میں تمہارے پاس اس لیے تو آئی ہوں کہ تم سے باتیں کروں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ادھر دو ماہ سے تمہاری طبیعت خراب چل رہی ہے۔ یہاں آکر یہ تو میں نے دیکھا کہ تم روزانہ دوا کھاتے رہتے ہو۔ وہ بھی بھابی کے کہنے پر۔ کیا تم اپنے آپ کے دشمن ہو۔ ایسا کیوں کرتے ہو بھیا۔ اپنی صحت کا خیال رکھو۔ وہ رُتی رہی۔

اس نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ تم روتی کیوں ہو۔ کیا میں مرجاؤں گا۔ تم روتی کیوں ہو — اور کیا تمھارے آنسو میری بیماری کو یا میرے کام کو کم کر سکتے ہیں۔ دور کر سکتے ہیں۔ تم روؤ نہیں میری بہنا۔ اتنا کہہ کر اس نے وہ ٹیبل پر رکھی ہوئی چائے کی پیالی اٹھا کر اپنی بہن کو دی تھی اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ "تم روتی ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا" بہن چائے کی پیالی لینے کے بجائے اس کی گود میں سر رکھ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی اس کے رونے کی آواز سن کر اس کے بچے آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے اپنی ممی اور ماما کے قریب آئے اور ممی کو روتے ہوئے دیکھ کر دونوں لڑکیاں اور لڑکا زور زور سے رونے لگے۔

اس نے کرسی سے اٹھ کر دونوں لڑکیوں اور لڑکے کو اپنے پاس بلالیا۔ دونوں لڑکیوں کو ٹیبل پر بٹھایا اور لڑکے کو گود میں لے کر کہنے لگا۔

پیارے بچو! روتے کیوں ہو۔ کیا میں مرنے والا ہوں۔ ارے ارے تمھیں دیکھ کر میں کتنا خوش ہوتا ہوں۔ مگر بچے اپنی ماں کو روتا دیکھ کر ماما کی باتوں سے بے اثر ہی رہے۔

ٹیبل پر رکھی ہو چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بچی کو آواز دی۔ دیکھو بیٹا یہ چائے لے جاؤ اور دوسری گرم چائے لے آؤ۔ کیوں بہنا تم گرم چائے پیو گی نا۔ ارے تم ہنسیں کیوں نہیں — میری پیاری بہنا۔

بہن نے ایک ہچکی لی اور زور سے رونے لگی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر اس کی ماں بھی دیوان خانے میں چلی آئی۔ کیوں کیا ہو رہا ہے۔ کیوں رو رہی ہو بیٹی۔؟ بہن نے جواب نہیں دیا۔ ساڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگی اور اس کی دونوں لڑکیاں اور لڑکا حیرت زدہ کبھی وہ اپنی ممی کو کبھی اپنی نانی کو اور کبھی ماما کو دیکھ کر

وقفہ وقفہ سے رونے لگتے ہیں۔

اس کی نظریں زمین میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ماں، بہنا کے قریب بیٹھی ہوئی ہے اور بار ہا ایک ہی سوال کر رہی تھی کہ بیٹے کیوں رو رہے ہو۔ اور بہنا ہے کہ بت بنی بیٹھی ہوئی ہے۔ تینوں خاموش ہیں، ماں، بیٹا اور بیٹی اور تینوں بچے بھی بڑوں کی خاموشی کو گمبھیر بنائے ہوئے ہیں۔ اچانک ماں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور خاموش چہرہ متفکر، پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگا۔ بہنا نے اپنی دونوں لڑکیوں سے کہا کہ بچیو تم جا کر باہر آنگن میں کھیلو۔ دیکھتی نہیں کہ ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر اپنے لڑکے سے کہا۔ جاؤ۔ بیٹا تم بھی باجی کے ساتھ کھیلو۔ لڑکا ماما کی گود سے اترا اور اپنے کُرتے سے آنسو پونچھتے ہوئے کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر اپنی بہنوں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

ماں نے روتے ہوئے کہا۔ کیوں بیٹا تمھیں کون سا روگ لگا ہوا ہے کہ تمھاری بیوی ہر خط میں یہی لکھتی ہے۔ تمھاری اس سال طبیعت گرتی جا رہی ہے اور ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہتے ہو۔ کہیں کسی آسیب کا سایہ تو نہیں ہوا۔ تم بہت چھوٹی عمر سے راتوں کے جاگنے اور سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ گردی کے عادی رہے ہو۔ بہو کہہ رہی تھی کہ تم یہاں بھی یہی سب کچھ کرتے رہے ہو۔ تم کسی عامل سے ملے تھے یا نہیں؟ وہ خاموش ہی رہا۔

ماں نے پھر کہا۔ تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟

ماں، میں کیا کروں۔ میں خود نہیں جانتا۔ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ میں کیوں موم کی طرح پگھلتا جا رہا ہوں۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

اسی لیے تو میں کہتی ہوں۔ تم کسی اچھے عامل کو بتاؤ۔ تمھیں ضرور کوئی آسیب کا سایہ ہوا ہے۔

تم نہیں جانتی ہو۔ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔

ہاں میں جانتی ہوں۔ ماں نے روتے ہوئے کہا۔ تمھارا اگر بس چلے تو تم مجھ پر بھی یقین نہیں رکھو گے۔

ماں تم سمجھتی کیوں نہیں۔ وہ جھنجھلا گیا۔ آسیب واسیب سب ہماری سمجھ کا چکر ہے۔ میں تم بن کر اپنے آپ کو نہیں سوچ سکتا۔

ہاں ہاں میں جانتی ہوں۔ تم نہیں مانو گے۔ مگر۔۔۔

ایسی بات نہیں ہے ماں۔ تم میری بات کو سمجھو۔ بیماری معمولی ہے تم سب اتنے پریشان کیوں ہو۔ دیکھو میں بھلا چنگا ہوں۔ تم فکر مت کرو۔

پلنگ پر لیٹی ہوئی اس کی بیوی نے اندر کمرہ میں سے کہا۔ میں ہر وقت کہتی ہوں کہ رات جاگا نہ کرو۔ مگر یہ کسی کی بات مانیں تب نا۔

ارے تم کیا کہہ رہی ہو۔ خاموش لیٹی رہو۔ دیکھو تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ڈاکٹر نے تمھیں آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔

ماں۔ اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ چپ رہو۔ تمھاری وجہ سے میری بہو بھی بیمار ہو گئی۔

کیا کہہ رہی ہو ماں۔ ایسا نہ کہو۔ میری وجہ سے، کیوں ثمینہ ماں جو کہہ رہی ہے کیا یہ سچ ہے؟

میں کیا کہوں۔

تم بھی ان کے ساتھ ہو گئی ہو۔؟

بہنا پھر رونے لگی۔ بھیا تم گھر چلو۔

کیا یہ گھر نہیں ہے۔۔۔ تم۔۔۔

ماں نے بیچ میں ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تم دونوں بیمار

ہو۔ تم دونوں کی یہ حالت دیکھ کر تمھارا لڑکا پریشان نہ ہو جائے اور وہ اپنے پوتے کو گود میں لیے۔ میرا لاڈلا، میرا پیارا کہتے ہوئے اس کے گالوں پر چٹ چٹ پیار لینے لگی۔

لڑکا کھلونے دیکھ کر دادی سے کہنے لگا۔ پپّا لائے ہیں۔

اچھا تمھارے پپّا کھلونے بھی لائے ہیں۔ تمھارے پپّا کو کیا ہوا ہے۔ لڑکے کے لیے دادی کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ لڑکا دادی کی گود میں اٹھ کر اس کے بہنا کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔

بہنا بدستور رو رہی ہے۔

ماں نے بہنا سے پوچھا۔ بیٹی تو اتنا کیوں رو رہی ہے۔ تیرا بھیّا اچھا ہو جائے گا۔

پیاری بہنا تمھیں رونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں بیمار نہیں ہوں۔ خدا کے واسطے تم رونا بند کرو۔

بہنا اور زور زور سے رونے لگی۔

ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ تم نے وطن سے آتے وقت بار بار کیوں بھیّا کے پاس آنے کے لیے کہا تھا۔ اسی لیے کہ تم یہاں آکر روتی رہوگی۔ دیکھو بیٹا تمھارے پاس آنے کے لیے یہ بے چین تھی اور جس رات یہاں آنے کا ارادہ تھا۔ تمھاری بہنا سوئی ہی نہیں تھی۔

اس نے کرسی پر سے اُٹھ کر اپنی بہنا کے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑی شفقت سے کہنے لگا۔ بہنا تم رو رہی ہو۔ ارے کیا تمھارا بھیّا مر جائے گا۔ چل چل میری پیاری بہنا نارو، نارو، دیکھ میں تیرے لیے کیا لایا ہوں۔

نہیں بھیّا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ وہ بدستور روتی رہی۔

بھیّا وہیں فرش پر بہنا کے بازو بیٹھا - چھوڑو تم میری بیماری کو - میں بیمار نہیں ہوں - بھیا..... بھیّا - بھیا پھر وہ زور زور سے رونے لگی - تم سمجھتے ہو - بھیا - مگر میں کیا سمجھوں - !

ہاں بیٹی تم اتنا کیوں رو رہی ہو اور خود ماں بھی رونے لگی -

اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے چہرے کو بھی صاف کیا اور اندر کمرہ میں جہاں اس کی بیوی پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی چلی گئی -

پوچھا - کیا تم نے ان سے کچھ کہا تھا - بہنا مسلسل کیوں رو رہی ہے ؟

نہیں، میں نے ان سے کچھ بھی نہیں کہا - بیوی نے تعجب کرتے ہوئے کہا - پھر بہنا کو کیا ہو گیا -

باہر سے اس کا لڑکا روتے ہوئے اندر کمرہ میں چلا آیا - پپا پپّا وہ پم پم نہیں دے رہی ہے -

اچھا اچھا - ہم تمھیں ایک اور پم پم لا کر دیں گے - تم چپ رہو - اُس کا لڑکا اس کے پیروں سے لپٹ گیا اور پم پم کی رٹ لگاتا رہا -

اُدھر دیوان خانہ میں دونوں ماں اور بیٹی آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں - بہنا بدستور روتے ہوئے اپنی بات کہہ رہی تھی -

وہ آنگن میں رکھے ہوئے پانی کے مٹکے سے پانی لے کر پینے لگا - اُسے راحت سی محسوس ہوئی اور اس نے نل کے قریب جا کر اس کی ٹونٹی کھول دی - پانی نل سے گرنے لگا - اس نے نل کی ٹونٹی بند کر دی - اور ٹنکی کے نل کی ٹونٹی کھول دی - پانی ٹنکی میں آواز کے ساتھ گرنے لگا -

ماں بیٹی سے کہنے لگی - تم کچھ بھی کہو - اُسے ضرور کسی آسیب کا سایہ ہوا ہے - خاموش خاموش رہتا ہے - دیکھو تو جب پچھلی چھٹیوں میں گھر آیا تھا

تو اس کی صحت کتنی اچھی تھی مگر اب تو آدھا اُتر گیا ہے۔

اُس کے اور رہنا کے بچے نل کی ٹونٹی کھول کر پانی میں کھیلنے لگے۔ بچوں کے کپڑے گیلے ہو گئے۔ اس کی بیوی پلنگ پر لیٹے لیٹے بچوں سے کہنے لگی۔ وہاں سے ہٹ جاؤ۔ سردی لگ جائے گی۔

وہ بیوی کے پلنگ کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے بچوں سے کچھ بھی نہیں کہا۔

ہاں ماں بھیا کو کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ وہ اتنے خاموش نہیں رہتے تھے۔ دیکھو آٹھ دن سے گم سم ہیں۔

ہاں بیٹی۔ ضرور کوئی آسیب کا سایہ ہوا ہے۔

ماں ایک بات کہوں تم بُرا نہ مانو گی۔

میں تیری بات کا بُرا کیوں مانوں گی۔

ماں جب ہم یہاں آ رہے تھے نا۔ اس رات میں سو نہیں سکی تھی۔ ایسے نہیں ہے۔

ماں میری آنکھ کچھ دیر کے لیے لگ گئی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

کیوں کیا ہوا تھا بیٹی۔ تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا تھا۔

ماں مجھے ڈر لگ رہا تھا —

ڈر کس بات کا —

ماں کیا کہوں، کیسے کہوں۔ اب بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

مگر کیوں —

کیا کہوں ماں — بھیا، بھیا کو میں نے ......

کیا ہوا — ایسا کیوں کر رہی ہو۔ بیٹی کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو۔

نہیں ماں، میں بھیا کے بارے میں ایسا نہیں سوچ سکتی۔ نہیں میں
کچھ نہیں کہوں گی۔

بہنا پھر رونے لگی۔

کہتی کیوں نہیں بیٹی، رو کیوں رہی ہو۔

وہ بھیا۔۔۔ میری آنکھ لگ گئی نا۔ جب۔ جب میں نے دیکھا۔ بھیا ٹیبل
پر رکھا ہوا دودھ۔ نہیں ماں۔۔۔ میں نہیں کہوں گی۔۔۔

کہہ بھی دے بیٹی۔ کیا آسیب کو دیکھا تھا۔

نہیں ماں۔۔۔ وہ دودھ...... دودھ ٹیبل پر رکھا ہوا۔ بلّی نے پی لیا۔
بھیا باہر دالان میں پانی پینے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اور بلّی دیکھتے ہی
دیکھتے تڑپ تڑپ کر مر گئی۔

بہنا بدستور رونے لگی ہے۔

پلنگ پر لیٹی ہوئی اس کی بیوی زور سے چیخی۔۔۔ اور اٹھ بیٹھی۔ نہیں۔
ایسا ہرگز نہ کہو۔

اور وہ اس نے بہنا کے قریب آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور زیرِ لب
مسکرا دی۔

--

کالے گُلاب

...... اور ان کے ہاتھوں میں کالے گلاب تھے اور چہروں پر شبِ معراج کی تجلّی۔ وہ ایک ایک قدم اتنی آہستہ سے رکھ رہے تھے کہ زمین سے ان کا رشتہ اُوٹ لگ رہا تھا۔ فضا میں چاروں طرف مسرّتوں کے نغمے الاپ جا رہے تھے۔ ہر ایک چہرے پر مسکراہٹیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ کسی کے ہاتھ دعا کے لیے آسمانوں کی طرف اٹھے اور کسی نے تحسین آمیز اور مبارک خیز جملے کہہ کر قلب کی پاکی اور نیکی کا اظہار کیا تھا۔ بچّے خوش تھے کہ عید الفطر کا چاند نظر آنے والا ہے۔ نوجوان اپنی مسرّتوں کو عشق کی کامیابی کی علامت سمجھے ہوئے تھے۔

پھر کیا ہوا کہ دوپہر کی سخت پیٹھ برف کی مانند گھلنے لگی اور وہ شخص جس کی آنکھوں میں تیز روشنی تھی، سر جھکائے کاغذ پر کچھ لکھنے میں معروف تھا۔ پسینے سے شرابور ــــ وہ سیدھا ہوا اور ایک اچٹتی سی نظر سے کمرے سے باہر کی طرف دیکھا۔ پھر کاغذ پر جھک گیا۔

پھر کیا ہوا ــــ؟

بے ہنگم صداؤں کا جنگل ہمکنے لگا۔

روکو ــــ روکو ــــ آگے مت بڑھو ــــ

چاروں طرف ویرانی تھی۔ مسرتیں، الم کی بازگشت بن گئی تھیں ـــــ
وہ شخص جس کی آنکھوں میں تیز روشنی تھی۔ بے ہنگم صداؤں کی طرف اس کے کان دھرے تھے۔ اس کے چہرے پر سکوت تھا۔ سناٹا۔ وہ مبہوت۔ کسی بات کو سننے کے لیے چوکتا ہوا ــــ مگر اس کی سماعت تیز نہیں تھی یا اعتماد بحال نہیں ہوا تھا۔

"ـــــ وہی نہیں ہوتا جیسے ہونا چاہیے ـــــ"

وہ بڑبڑانے لگا۔

کیوں نہیں ہوتا؟

آخر ایسا کیوں ہے؟

پھر اس نے کانوں کو تیز کر دیا ـــــ

اس کی بیوی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا کہ وہی ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مگر کیا ہوا؟ تم بولتی کیوں نہیں ـــــ

سورج پگھل نہیں رہا تھا ــــ آسمانوں کے بیچوں بیچ سے کسی قدر ہٹا ہوا تھا۔

پھر اس نے اپنی بیوی سے دریافت کیا۔ یہ واقعہ کب ہوا؟

بیوی نے کہا۔ کون سا واقعہ کب ہوا! کہیں تم اپنے لڑکے کے بارے میں تو دریافت نہیں کر رہے ہو۔ وہ تو بھلا چنگا باہر بچوں میں کھیل رہا ہے۔

آج سورج پگھلا نہیں تھا۔ بلکہ آسمان کے بیچوں بیچ تھا۔ وہ کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا۔ اور بے دم ہو کر واپس ہوا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔

پھر اس نے اپنی بیوی سے دریافت کیا۔ نہیں جب سورج پگھلا نہیں تھا تب کیا ہوا؟ بیوی اس کے سوال کا جواب دیے بغیر کمرے سے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آیا ـــــ

چھوٹا بھائی فرش پر اکڑوں بیٹھے ہوئے اپنی بیوی سے باتیں کر رہا تھا۔

اس نے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔ کیا ہوا؟

چھوٹا بھائی فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "اب کوئی خطرہ نہیں ہے، سب کچھ ٹھیک ہے۔"

اس نے دیوار پر لگے ہوئے مذہبی کلینڈر کی طرف شکر گزار انداز سے دیکھا اور پنکھے کا بٹن آن کر دیا۔ فرحت اور راحت کا ایک احساس جاگزیں تھا۔ مگر قلبی اتھل پتھل کسی نہ معلوم خدشہ کی بیداری کا اعلان نامہ تھی۔ ایک لمحہ فراٹے سے آیا۔ خوشگوار احساس کے ساتھ نحوستیں در آئیں۔ اس نے اپنا سر جھٹکا۔ بیشک تو عظمت اور بزرگی والا ہے۔ تو قلب میں جھانکنے والا۔

پھر وہ اپنے کمرے میں آیا اور کاغذ اٹھائے بین انگلیوں میں دبائے ٹیبل کی طرف بڑھا۔ کاغذ ٹیبل پر رکھا۔ پھر کمرے کے باہر آیا۔

سورج مکان کی دیواروں کے اس پار تھا۔ مگر دیواریں سورج کی حدت کو انگیز کیے ہوئے تھیں۔

گھر کے تمام بچے آنگن میں کھیل رہے تھے۔ مگر دیواریں سورج کی حدت سے بدحواس تھیں اور سورج آسمان کے کناروں سے آزاد ہونے کی سعی میں مصروف تھا۔

ایک بچہ جو عمر میں ہی کوئی سات برس کا ہوگا۔ گھوڑا بنا ہوا تھا۔

ایک بچی جو عمر میں ہی کوئی چھ برس کی ہوگی۔ گھوڑے پر سوار تھی۔

بچی بچے پر بیٹھے ہل رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

چل میرے گھوڑے ٹک ٹک ٹک ٹکاٹک ٹکٹک۔

بچہ آگے بڑھنے کی کوشش میں تھا۔ بچی نے ایک زور کا ہاتھ بچے کی

پیٹھ پر مارا —

بچہ غصہ سے اٹھا اور زکی زمین پر گر گئی - مگر روئی نہیں - بچہ ہنستا ر
سورج آسمان کے کناروں سے بھی دور ہوتا چلا گیا اور موذن نے اذا
دی -

دستاویزی لمحوں کا وعدہ بے وفائی کا منھ چڑاتا رہا - اور اس نے
اپنے آپ کو ایک لمبی سانس کے حوالے کیا اور اس کا سارا جسم غیر موجود کا وجو
لمحہ تھا - اور پھر ماں کے استعارہ کا مفہوم تحلیل ہو چکا تھا - اس کی زبان پر
صرف ایک ہی جملہ تھا -

"تو میری ماں کا دوسرا روپ تھی —"

سوالات اور احساسات کے جنگلوں میں تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے -
اس نے پھر چھوٹے بھائی سے دریافت کیا "ایسا کیوں کر ہوا؟"
چھوٹا بھائی اس کا منھ تکنے لگا - مشیت ایزدی کو کون جانے؟ پھر
اس کی نظریں نیچی ہوئیں -
لڑکے ہچکیاں لے کر رو رہے تھے اور لڑکیاں بین کر رہی تھیں
پورا ماحول یوم شہادت کا منظر نامہ تھا -
اس کی نظریں سامنے رکھے ہوئے چادر میں لپٹی ہوئی لاش
پر تھیں اور آنکھوں سے آنسو خاموشی سے بہہ رہے تھے -
بیل پوش آنگن میں گھری ایک دیوار سے تند محاورے کی طرح آنگن میں ٹہو
جو کتنا رہی اور پھر دوسری دیوار سے ہوتی ہوئی چھت میں غائب ہو گئی -

— —

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی

حالانکہ وہ چھٹی کا دن تھا مگر وہ آفس آیا ہوا تھا۔ جس وقت وہ
فس کے احاطے میں پہنچا۔ اس وقت وہاں صرف چوکیدار تھا ہر طرف خاموشی
ی۔ آفس شہر کی پُر رونق سڑک سے پچاس قدم کے فاصلے پر ایک گلی
ں تھا۔ ویسے لوگوں کی آمد و رفت ہر وقت رہتی ہے۔ مگر آج چھٹی کا دن
ہے۔ اس لیے سڑک پر اور نہ ہی گلی میں کوئی متنفس نظر آرہا ہے۔ اپنے
ے میں آکر رکا چوکیدار نے کمرہ کا قفل کھولا۔ اس نے آفس میں داخل ہوتے
ی پنکھے کا بٹن آن کر دیا۔ اس کے پیچھے ہی چوکیدار نے کمرے کے کونے میں رکھا
وا کپڑا اٹھایا۔ کرسیاں اور ٹیبل صاف کرنے لگا۔ اس نے بغل میں دبائے
ئے فائل ٹیبل پر پٹخ دیے، پورے کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور
رسی میں دھنس گیا۔ فائل کھول کر کاغذات ادھر اُدھر کرتے ہوئے کسی
لے پر غور کرنے لگا۔ اُسے کسی کے قدموں کی آواز کا احساس ہوا۔ مگر اس کی
ریں فائل پر ہی جمی رہیں۔ قدموں کی آواز دھیرے دھیرے اُس کے قریب
نے لگی۔ اُس نے گردن اٹھائے بغیر ہی کہا۔

کون ہے ــــ؟ چوکیدار ــــ؟

نہیں میں ہوں — آپ سے ملنے آیا ہوں " اجنبی نے کہا۔
کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی کی نظریں بدستور فائل پر جمی ہوئی تھیں
ہیں یعنی کون — ؟
اجنبی نے کچھ بھی نہیں کہا — وہ خاموش کھڑا رہا۔
کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے پوچھا — تم نے میرے سوال کا جواب
نہیں دیا۔
کیوں خاموش ہو — ؟
اجنبی نے اس مرتبہ پھر کچھ نہیں کہا اور کمرہ کا جائزہ لینے لگا۔ مگر کرسی میں
دھنسے ہوئے آدمی نے اجنبی کو بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ اجنبی حیران و پریشان
اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شاید سوچ رہا ہو کہ یہ آدمی ہے ؟
اجنبی نے کچھ توقف کے بعد کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی سے اجازت لی۔
"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں " کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے بغیر گردن اٹھائے
ہوئے کہا — " ہاں بیٹھ جاؤ " اور اپنی پتلون کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ
اور لائیٹر نکالا اور سگریٹ سلگایا۔ اسی مصروفیت کی حالت میں بازو والی الماری
سے ایک بوسیدہ فائل اٹھا کر ٹیبل پر رکھا اور کچھ پڑھنے لگا۔
اجنبی کی بے چینی و بے قراری بڑھنے لگی اور اس کے پیر ہلنے لگے مگر اس کی
بے چینی و بے قراری بے کار و بے معنی ہے۔ وہ کمرے کی دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں
کو دیکھنے لگا۔ اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ ایک ایک تصویر کے ساتھ اس کے ذہن
میں کچھ باتیں گھومنے لگیں۔
یہ گاندھی جی کی تصویر ہے — اہنسا کے اصولوں پر چلنے والے۔
یہ لال بہادر شاستری کی تصویر ہے — جے جوان جے کسان

اور یہ کون ہے، کون ہوگا ــــــ؟ میں نہیں جانتا، شاید کوئی شاعر ہوگا۔ بیکھک ہوگا یا پھر کوئی اور ــــــ اور ــــــ

اجنبی، کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوا۔" کیا آپ مصروف ہیں ــــ"

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے کسی قدر گردن اٹھائے ہوئے کہا ــــ دیکھوں، کیا بات ہے ــــ"

اجنبی نے کہا ــــ" کیا میں جا سکتا ہوں ــــ"

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے کہا ــــ" کیوں ــــ"

اجنبی نے کہا ــــ" اس لیے کہ آپ مصروف ہیں ــــ"

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے کہا ــــ" کیوں ــــ میرے پاس کیا ہے۔ اور تم مجھ سے مل کر کیا کرنا چاہتے ہو ــــــ"

اجنبی نے کسی قدر ذہن پر زور ڈالتے ہوئے، دھیمی آواز میں کہا۔" ہاں میں یہاں کیوں آیا تھا۔ آپ سے مل کر کیا کرنا چاہ رہا ہوں۔ بس یہی کہ آپ کون ہیں جان لینا چاہتا ہوں ــــ"

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی، کرسی کی پشت کو ٹیک لگا کر، سگریٹ کا لمبا کش لیتا ہوا کسی قدر سلجھے ہوئے انداز میں کہتا ہے ــــ" یہ سوال مجھے کرنا چاہیئے تھا۔ اب تم مذاق چھوڑو۔ صاف صاف بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے ہو ــــ؟"

اجنبی نے بڑی لاپرواہی سے کہا ــــ" میں صاف صاف ہی کہہ رہا ہوں۔ میرا تم سے کوئی کام نہیں ہے بس یوں ہی چلا آیا ہوں ــــ"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ــــ" کیا مطلب ــــ"

اجنبی ــــ "صاف ظاہر ہے۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ــــ "تم بے وقوف لگتے ہو۔"

اجنبی ــــ "تمھارے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ــــ "کیا باہر میرا چوکیدار نہیں تھا؟"

اجنبی ــــ "وہ اونگھ رہا ہے۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ــــ "کب سے؟"

اجنبی ــــ جب سے، میں یہاں آیا ہوں۔"

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی کے چہرے کا رنگ بدلتا ہے۔" ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ مگر تم کس توقع میں بیٹھے ہوئے ہو۔" پھر اس کی نظریں ٹیبل پر رکھی ہوئی فائل پر جمتی ہے۔

اجنبی۔" کچھ دیر، تم سے باتیں کر کے اپنے آپ کو ہلکا محسوس کر سکوں۔ اس لئے۔"

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی کا چہرہ لال ہوتا ہے اور زور سے کہتا ہے۔

"کیا تم نے مجھے باتونی، بکواسی اور بے کار آدمی سمجھا ہے؟"

اجنبی ــ" نہیں۔ میں ایسا سوچ رہا ہوں۔ میرے دماغ میں اور بھی کچھ باتیں تھیں۔ مگر تم اپنے کام میں مشغول تھے اسلئے ساری باتیں دماغ میں ہی غائب ہو گئیں

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی۔ اس کے چہرے کے تاثرات پھر بدلتے ہیں۔

"تو ٹھیک ہے۔ اب تم تشریف لے جا سکتے ہو۔"

اجنبی ــ" وہ تو میں چلا جاؤں گا ..... میرے چلے جانے کے بعد تم کیا کروگے؟ وہ کرسی۔ اور کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی کی طرف دیکھتا ہے۔

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی غصہ سے کہتا ہے۔" تم کون ہوتے ہو۔ ساری

باتیں پوچھنے والے "

اجنبی ۔" ہاں' میں کون ہوتا ہوں، مگر تم کیا کروگے یہ سب جان کر "

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی " میں کچھ بھی کروں۔ میرے کاموں سے تمھیں کیوں اتنی دلچسپی ہے "

اجنبی ۔" خیر۔ تم کیا کروگے۔ یہ جان کر کہ میں کون ہوں "

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی " میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ تم کون ہو۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تمھیں میرے کاموں سے اتنی دلچسپی کیوں ہو رہی ہے۔ تم کوئی بھی ہو۔ مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے "

اجنبی ــــ مسکراتے ہوئے " لگتا ہے۔ تم خفا ہو رہے ہو۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ــــ بیزاری سے " تم کبھی ٹھیک نہیں کہہ سکتے۔ کہ تم انتہائی فضول اور نامعقول لگتے ہو "

اجنبی ۔ اطمینان سے " ٹھہرو ــــ ایک بات بتاؤ۔ میں جس وقت یہاں تمھارے پاس آیا تھا۔ تم کیا کر رہے تھے۔

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ۔ گھبراتے ہوئے " کیا کر رہا تھا۔ کچھ پڑھ رہا تھا "

اجنبی " کیا پڑھ رہے تھے "

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ــ" تم کون ہوتے ہو۔ تمام تفصیلات جاننے والے ؟"

اجنبی ــــ" میں یہ کہتا ہوں کہ تم کچھ نہیں پڑھ رہے تھے "

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ــ بیزاری سے " ٹھیک ہے ٹھیک ہے

پھر میں کیا کر رہا تھا ۔ ؟"

خود سے پوچھتا ہے ۔ خاموش ہوتا ہے اور اس کی نظریں سامنے رکھی ہوئی فائلوں پر پڑتی ہیں ۔

اجنبی ـــــ خاموشی کو توڑتے ہوئے کہتا ہے "۔ تو پھر بتاؤ ۔ تم کیا پڑھ رہے تھے ؟"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی کسی قدر خفگی سے کہتا ہے "۔ پھر وہی نان سنس قسم کی بات ـــــ میں کچھ بھی پڑھوں تمھیں اس سے کیا سروکار ـــــ"

اجنبی ـــــ "چلو خاموشی تو ٹوٹ گئی ۔ میں یونہی پوچھ رہا تھا ۔ مگر تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو ؟"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی "۔ عجیب نامعقول آدمی ہو ۔ تم بھی ۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں تمھاری طرح سے بے کار آدمی تو نہیں ہوں "۔

اجنبی ـــــ "۔ یعنی کہ میں بے کار آدمی ہوں ۔ اور تم کارآمد اور مصروف ترین"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی "۔ بالکل ۔ تم صد فی صد بیکار آدمی ہو ۔ یہاں کیوں چلے آئے ہو ۔ جان نہ پہچان خالہ اماں سلام "۔

اجنبی ـــــ "۔ پھر ناراض ہو رہے ہو "۔

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی "۔ ناراض ہو کر میں اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتا ۔

اجنبی نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا "۔ اچھا تو میں جاؤں ؟"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی "۔ کیا تم میری اجازت لے کر اندر آئے تھے ، ویسے تم جا سکتے ہو "۔

اجنبی ـــــ "۔ یہ بات تو درست ہے کہ میں تمھاری اجازت لے کر اندر نہیں

آیا تھا ۔"

اچانک کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے میز کی دراز کھول کر اندر سے ایک لفافہ نکالا اور اس کے اندر سے کچھ کاغذات نکال کر تیزی سے پڑھنے لگا اور اجنبی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اجنبی کھڑا رہتا ہے۔ پھر پوچھتا ہے ۔" کیا میں جا سکتا ہوں ؟"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی خاموش، اس کی طرف خوف زدہ ہو کر دیکھنے لگا اور اس کے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے اور اپنی انگلیوں کی لکیروں پر تیزی سے اپنا انگوٹھا پھیرنے لگا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چوکیدار کو آواز دی۔

"رام دھن ـــ رام دھن ـــ ارے او رام دھن ـــــــــ

پتہ نہیں۔ یہ منحوس بھی اس وقت کہاں چلا گیا ـــ کوئی کام وقت پر نہیں ہوتا اور کچھ کام تو بے وقت ہوتے ہیں۔ میں اس سے تنگ آ گیا ہوں۔ کہاں گیا ہوگا۔ رام دھن ۔"

مگر اس کی نظریں اجنبی پر جمی ہوئی ہیں اور اس کا انگوٹھا تیزی سے انگلیوں پر گھوم رہا ہے۔ باہر سے گلاس کے گرنے کی آواز آتی ہے۔ کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ایک دم کرسی پر اچھل پڑتا ہے ۔" کون ـــ رام دھن ـــ کہاں مر گیا تھا بے اِدھر آ ـــ یہاں آ ـــ کوئی کام وقت پر نہیں کرتا ۔"

مگر باہر سے کوئی آواز نہیں آتی ۔ اور نہ ہی رام دھن آیا۔ پھر وہ بڑبڑانے لگتا ہے۔

" آخر کیا ہو رہا ہے یہ سب کچھ ـــ دراز سے نکالے ہوئے کاغذات اندر دراز میں رکھتا ہے۔ اپنے آپ کو تسلی دینے لگتا ہے۔ کرسی پر پیر لمبے کر کے کسی قدر دراز ہوتا ہے اور اجنبی سے پوچھتا ہے ۔" ہاں تو تم نے کیا کہا ـــ ؟"

اجنبی حیرت زدہ ہو کر "تم کیا سوچ رہے ہو؟ کیا میں جا سکتا ہوں؟
کرسی میں دھنسا ہوا آدمی۔ اِدھر اُدھر راز دارانہ انداز میں دیکھتے ہوئے
پوچھتا ہے "کیوں؟"
"اجنبی — مجھ سے کوئی کام ہے؟"
کرسی میں دھنسا ہوا آدمی — "نہیں۔ کوئی کام نہیں ہے۔ بس بیٹھو۔"
اجنبی۔ گھبراتے ہوئے۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ مگر کیوں۔ کیا مجھ
سے کوئی اور کام ہے؟"
کرسی میں دھنسا ہوا آدمی۔ کسی قدر بلند آواز میں کہتا ہے "اور کام!
کیا مطلب؟"
اجنبی — "پھر — اور — کام —"
کرسی میں دھنسا ہوا آدمی — "اس سے پہلے میرا کون سا کام تم نے
کیا تھا؟ جواب کہہ رہے ہو کہ کوئی اور کام —"
اجنبی "— خیر — مجھے یاد نہیں ہے۔ کیا تم میرے بارے میں نہیں
سوچ رہے تھے —"
کرسی میں دھنسا ہوا آدمی۔ حیرت سے! "تمھارے بارے میں نا معقول"
اجنبی — "یہ ایک حقیقت ہے"
کرسی میں دھنسا ہوا آدمی — "کیا عجب آدمی ہو" وہ اپنے لمبے
لمبے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔
اجنبی — "پھر میں جا سکتا ہوں —؟"
کرسی میں دھنسا ہوا آدمی — "ہاں ہاں جا سکتے ہو"
اجنبی — "کیا تم نے اب تک مجھے پہچانا نہیں —؟"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ــ "میں اپنے سوا کسی اور کچھ نہیں جانتا۔"

اجنبی ــ "کرسی کو بھی۔ خیر اب میں جاتا ہوں۔ مگر یاد رکھو۔ تمھیں میری ضرورت پڑے گی۔ تم میرے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہاں۔ اور یہ بھی یاد رکھو اس کے بعد پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ اور تم میرے بغیر بے حال ہو جاؤ گے سمجھے۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی "جاؤ جاؤ، بہت ہو چکا۔ بہت آتے ہیں ایسے ایرے غیرے۔ تمھیں بھلے آدمی میں تمیز کرنی آتی ہے یا نہیں؟

اجنبی "کیا یہی سوال میں تم سے کر سکتا ہوں؟"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی۔ "میں کہتا ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔

اجنبی ــ ہاں ہاں۔ ہاں جاؤں گا۔ مگر ایک مرتبہ اور کہوں گا کہ تم میرے بغیر بے یار و مددگار رہو گے۔

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی "مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے، جاؤ چلے جاؤ۔

اجنبی تیزی سے قدم بڑھاتا ہے اور کرسی میں دھنسا ہوا آدمی پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا۔ حیرت زدہ اجنبی کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے اور ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

ــ ــ

روشن لمحوں کی سوغات

"دُکھ پرندے کا نام نہیں۔ دکھ تو کچھ اور ہی ہے ـــ مرشد شاہ عالم نے سر اٹھا کر دیکھا۔

نثار ملک زور زور سے چیخ رہا تھا۔ میرے اندر کچھ ہو رہا ہے۔ کیا واقعی پرندہ پھڑ پھڑا رہا ہے' اے مرشد! کیا آپ نے میرے لیے عذاب کا انتخاب کیا ہے۔؟ مرشد میں نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ ہمارا سمندر آپ کا سمندر الگ ہے۔ آپ نے اماوس کی رات بھی گمبھیر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ کیوں۔ آخر ایسا کیوں ـــ؟ کیا آپ کی نظروں میں سب ایک ہیں' مرشد' ذرا لب کشائی کیجیے ـــ

تینوں مریدوں نے نثار ملک کے لبوں کو بند کرتے ہوئے کہا "ارے او کمبخت! مرشد سے گستاخی کرتا ہے۔ ذرا اپنا ہوش سنبھال ـــ کیا کہہ رہا ہے۔ ذرا تو روشنی اور اندھیرے کے بارے میں دریافت کر لے۔ تو نے ہی اپنا دکھ بتایا تھا' ہم سے ـــ"

مرشد زیر لب مسکراتے ہوئے' اپنے چاروں مریدوں سے گویا ہوئے "اے میرے عزیزو! تمھیں شک میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ روشنی اور اندھیرے کو سمجھو یہ تمھاری بینائی کا دوش ہے' تم روشنی کس چیز کو سمجھ بیٹھے ہو

اور اندھیرا کس چیز کو —— یاد رکھو! ہر شے اپنا رنگ و روپ بدلتی رہتی ہے۔ ہر شے کا مقدر تبدیلی ہے۔ تم جس طرح چاہو، اس کو دیکھو، اسے استعمال کرو۔ اگر تمھارا اس شے پر اختیار ہو۔ بس اتنا جانو، تمھارا اختیار کیا ہے اور تم بے بس کہاں ہو۔ اختیار اور حدود کی پہچان، دراصل تمھارے قلب کی پہچان ہے۔ مجھ سے وہ سب کچھ نہ بولو اور نہ مانگو جو میرے حدود اور اختیار سے پرے ہے۔ سوچو تو یہ دنیا غلطتوں سے بھری پڑی ہے اور ہماری صداقتوں اور سچائیوں کے لیے ایک بہترین انتخاب گاہ ہے۔ نہ سوچو تو پھر تم اپنی ذمہ داری قبول کر لو۔ ایسا نہ سوچو کر تم بے اختیاری سے اختیار اور اختیار سے بے اختیاری کے دائرہ میں رقص کرنے لگو۔ روشنی ہر طرف ہے۔ صرف تمھاری آنکھوں کی بصارت و بصیرت چاہیے۔"

نثار ملک کی آنکھوں سے آنسو رواں دواں ہیں اور وہ سر جھکائے بیٹھا ہوا ہے۔ اور اس کے تینوں ساتھی مرشد کی باتوں کو دھیان سے سن رہے ہیں۔ تینوں کے چہروں پر حیرت کے طویل سائے دکھائی دے رہے ہیں۔

نثار ملک ہچکیاں لے رہا ہے۔ مگر اس کی زبان بند ہے۔ ایک ساتھی جس کے سر پر کپڑا آڑا ترچھا لپٹا ہوا ہے آگے بڑھ کر نثار ملک کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر مرشد، انگلی کے اشارے سے اُسے اپنی جگہ پر بیٹھنے کے لیے کہتے ہیں۔

نثار ملک سیدھا ہوتا ہے اور آہستہ سے اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے پیر لڑکھڑاتے ہیں وہ وہیں بیٹھتا ہے پھر اٹھتا ہے اور مرشد کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ مرشد بدستور زیر لب مسکرا رہے ہیں۔ نثار ملک آگے بڑھ کر مرشد کے قدموں میں گرتا ہے اور زار و قطار رونے لگتا ہے۔ مرشد خاموش، نثار ملک کے تینوں ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کا دایاں ہاتھ نثار ملک

کی پیٹھ پر رکھا ہوا ہے۔ مرشد، نثار ملک کے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔

"تم جانو، رات اندھیری ہے، مگر اس میں بھی تم دیکھ سکتے ہو، کیا تم نہیں سوچتے ہو کہ یہ اندھیرا ہے۔ پھر کیا تمہیں کبھی کبھار خوف نہیں ہوتا"

تینوں ایک ساتھ کہتے ہیں ــــ "جی ـ مرشد، بات تو سچ ہے آپ اندھیرے کا راز تو بتا دیجئے۔"

مرشد پھر مسکراتے ہیں۔ "اندھیرا ـ اندھیرا" وہ بازو میں رکھے ہوا چراغ کی لو بجھا دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں۔ "اب کہو۔ تم کہاں ہو؟"

تینوں ساتھی ایک ساتھ ــــ "ہم آپ کے سامنے"

مرشد پھر پوچھتے ہیں ــــ "نثار ملک کہاں ہے؟"

تینوں ایک ساتھ ــــ "آپ کے قدموں میں"

مرشد کہتے ہیں ــــ "پھر تم کیوں نہیں ہو"

تینوں خاموش ہیں۔

مرشد سوال کرتے ہیں "کیوں خاموش ہو۔ کیا تم اور نثار ملک الگ ہیں؟ بس جانو کہ اندھیرے اور روشنی کے درمیان فاصلہ یہی ہے"

مرشد کہتے ہیں "تم میں سے کوئی آگے بڑھے اور یہ چراغ روشن کر دے تمہیں روشنی کی ضرورت ہے نا ــ اور نثار ملک کو اندھیرے کی"

تینوں ساتھی ایک ساتھ کہتے ہیں "یہ کیسے ممکن ہے۔ نثار ملک کو بھی روشنی کی ضرورت ہے۔"

مرشد "لیکن تمہیں چراغ کی روشنی کی ضرورت ہے اور نثار ملک

....

تینوں ساتھی ایک ساتھ۔ "اے پیرو مرشد! ایسا کیونکر ممکن ہے؟"

مرشد۔ "دیکھو نثار ملک خاموش ہے اور تم روشنی کے لیے بے قرار۔

"بس تو جانو کہ روشنی کا مطلب بھی بدل جاتا ہے۔ لوگوں کے درمیان۔" ایک ساتھی اندھیرے میں اٹھ کر راستہ ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور اپنے جیب سے ماچس نکال کر بتی جلاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ مرشد اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہیں اور نثار ملک قدموں میں بدستور پڑا ہوا ہے وہ آگے بڑھ کر چراغ جلاتا ہے۔ مرشد زیر لب مسکرا رہے ہیں ۔ اور دونوں ساتھی اپنی جگہ سے اٹھ کر مرشد کی طرف بڑھتے ہیں مگر مرشد اپنی انگلی کے اشارے سے انھیں وہیں بیٹھنے کے لیے کہتے ہیں۔

نثار ملک اٹھتا ہے اور مرشد کے سامنے رکھا ہوا پیالہ اٹھاتا ہے اور ایک ہی سانس میں پی لینے کی کوشش کرتا ہے۔

مرشد کہتے ہیں۔ "ایسا نہ کرو اے عزیز آہستہ آہستہ تین سانسوں میں پی لو۔"

نثار ملک مرشد کی طرف دیکھتا ہے اور پانی آہستہ آہستہ تین سانسوں میں پی لیتا ہے۔ پھر گریا ہوتا ہے "مرشد اندھیرے سے اندھیرے تک روشنی ہی روشنی ہے۔ یہ سچ ہے مرشد کہ سمجھو تو بڑی چیز ہے دُنیا۔"

تینوں ساتھی ایک آواز میں کہتے ہیں "یہ نقصان کی جا ہے۔"

مرشد "نہیں ایسا نہ کہو ۔ تمھارا جتنا نقصان یہاں ہوتا ہے وہی تمھارا فائدہ ہے۔ دیکھو عزیز! فائدہ بھی تمھارا ہی ہے اور نقصان بھی تمھارا۔"

نثار ملک ۔ اچانک کہنے لگتا ہے۔ گھوڑا آ رہا ہے مرشد! گھوڑا آ رہا ہے اور اس پر ایک وجیہہ اور شکیل لڑکا سوار ہے اور اس کا ہاتھ باگ پر بھی ہے۔ مگر باگ ڈھیلی ہے۔ کیا روشنی ہو گئی مرشد"؟

مرشد تینوں ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں اور غور سے نثار ملک

کی باتیں سننے لگتے ہیں۔ "کیا سچ مچ تم گھوڑے پر ایک خوبصورت لڑکے کو دیکھ رہے ہو؟"

نثار ملک :- "جان کی امان ہو تو حضور عرض کروں - یہ سچ ہے، جو میں نے بیان کیا۔"

مرشد :- "مگر میرے عزیز یہ تو کہو - لڑکے کے ہاتھ میں باگ کیوں ڈھیلی ہے؟"

تینوں ساتھی غور سے مرشد اور نثار ملک کی باتیں سُن رہے ہیں۔

نثار ملک :- "میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر لڑکا پر اعتماد ہے - آپ بھی دیکھیے — — ہاں — ہاں —

"مرشد — ذرا غور سے دیکھیے گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا ہے اور گھوڑے پر سوار لڑکا بے پناہ اعتماد کے ساتھ اس کی باگ ڈھیلی رکھے ہوئے خوش خوش نظر آ رہا ہے۔"

مرشد :- "کیا تمھیں واقعی لڑکا پر اعتماد نظر آ رہا ہے؟"

نثار ملک :- "ہاں کیوں نہیں۔"

مرشد :- "کیا تم اس کو ہماری طرف بلا سکتے ہو — ؟"

نثار ملک :- "ایسا کیونکر ممکن ہے! لڑکا اپنی دھن میں اوبڑ کھابڑ راستوں پر بغیر کسی تکلیف کے گھوڑے کو بھگائے جا رہا ہے۔ آپ میری باتوں پر یقین کیجیے مرشد!"

مرشد :- "میں شک میں نہیں پڑتا — وہ دیکھو، وہ پہاڑ — اس پر ایک گٹھری نظر آ رہی ہے نا — پتہ نہیں تمھیں دکھائی دے رہی ہے یا نہیں — "میرے عزیزو! شک کی آنکھ میں پتھر دے مارو — اور پھر اپنے چاروں طرف دیکھو — تمھیں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آئے گی جو آنکھ کو اندھا کر دے — ہر شے میں بصیرت تلاش کرو — کیا تمھیں ایسی کوئی گٹھری نظر آ رہی ہے جس میں آڑی ترچھی لکیریں ہیں — ؟"

تینوں ساتھی کہتے ہیں: "مرشد۔ ہمیں تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے نہ کوئی گھوڑا اور نہ ہی کوئی گٹھری اور نہ ہی پہاڑ — پہاڑ پر تو روشنی ہوتی ہے نا۔؟"

مرشد — "ہاں عزیزو تم نے کچھ جان لینے کی کوشش کی ہے، پہاڑ پر روشنی ہوتی ہے۔ کیا تم میں سے کسی میں اتنی ہمت ہے پہاڑ پر چڑھ کر گٹھری لے آئے؟" مرشد اپنی داڑھی میں خلال کرتے ہوئے پوچھتے ہیں۔

تینوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور نثار ملک کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں۔

مرشد اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں — "عزیزو! اپنی جان کو خطرات میں مت ڈالو — ٹھیک ہے۔ پہاڑ پر روشنی ہی ہے۔"

تینوں ساتھی ایک ساتھ آواز کرتے ہیں: "ہاں، ہاں سچ ہے —" اور وہ تینوں خوش ہوتے ہیں اور گٹھری کو بھول جاتے ہیں۔

نثار ملک، بدستور رو رہا ہے: "مرشد، وہ گھوڑا اور لڑکا —"

مرشد "انتظار کرو۔"

نثار ملک وہ گھوڑا تیز گام ہے اور لڑکا، اس کے چہرے پر چاند کا ہالہ اور اس کی باتوں میں حسن کی راتیں، اس کے انداز میں کائنات کی دھڑکن اس کے پیروں میں دھڑکتی ہوئی دھرتی باوجود اس کے کہ اس کے ہاتھ میں گھوڑے کی باگ بھی ہے۔"

مرشد "گھوڑے کی باگ اس کے ہاتھ میں ڈھیلی ہو تو کوئی بات نہیں، میرے عزیز! کیا وہ گھوڑا اور لڑکا نظر آرہے ہیں؟"

نثار ملک — "ہاں مرشد! وہ آرہا ہے — وہ آرہا ہے۔" مرشد نثار ملک کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ مرشد کے قدموں پر گرتا ہے۔

پھر......

مرشد گویا ہوتے ہیں۔

"اے عزیز! روشنی اور اندھیرا ہماری آنکھوں کے لیے ہے۔ ڈرو نہیں۔ اپنی جان جوکھم میں نہ ڈالو ـــــ روشنی اور اندھیرا ہمارا مقدّر ہیں ـــــ اور دکھ پرندے کا نام کیسے ہو سکتا ہے!"

▬ ▬

اور ہاں اچھی طرح یاد رکھو ـــــ

بغیر سمت کا تعین کیے آگے بڑھنا مناسب نہیں ۔ یوں بھی راستے سیدھے
نہیں ہیں ۔ آڑے ترچھے نیچے اوپر اور تو اور کہیں کہیں راستہ نہ ہونے کا گمان
ہوتا ہے ۔ دیکھو گھبراؤ نہیں ۔ ہمت و جرأت سے میدان مار لوگے اور جب تمھیں
راستہ نظر نہ آئے خود ہی راستہ پیدا کر لو اور اس کا افتتاحی ربن کاٹ دو ۔
تمھیں پورا پورا حق ہے ۔

کئی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک ایسی جگہ نظر آئے گی کہ تم پھر گھبراؤ
گے ۔ نشیب ہی نشیب نظر آئے گا ۔ وہاں تمھیں ہمت واستقلال سے ایک آواز
بلند کرنا ہوگی ۔

" راستے میری مٹھی میں ہیں "

راستے خود بخود تمھارے قدموں میں چلے آئیں گے اور ہاں آسمان نیچے
آتا ہوا نظر آئے گا ۔ کوئی بات نہیں ۔ بے نیازی سے آگے بڑھو ۔ اب تمھاری مٹھی
میں راستے تلملاتے رہیں گے ۔

اب تک تم کون سی سمت میں تھے ۔

جنوب میں ـــ

اور اب شمال کی طرف بڑھو ـــ یہاں راستے فراز ہی فراز میں نظر آئیں گے۔ ممکن ہے کہ تم تھوڑی دیر ہی میں تھک جاؤ ـــ تھکن فطری عمل ہے۔ یہاں تم ایک اور آواز بلند کرو ـــ

"آسمان میری مٹھی میں ہے"

تمھاری ایک مٹھی میں زمین (راستے) اور ایک مٹھی میں آسمان ہوگا۔ پھر آگے کی طرف بڑھو۔ ایک بہت بڑا غار نظر آئے گا۔ وہاں سانپ اور بچھو نظر آئیں گے۔ سانپ بے حس و حرکت پڑے رہیں گے۔ جن کی آنکھوں میں غنودگی اور منھ میں پھونکیں بند ہوں گی۔ اور بچھو ڈنک اٹھائے اِدھر اُدھر گھومتے نظر آئیں گے۔ تمھارے پیروں میں لوہے کے جوتے ہیں نا؟ تو پھر بھیک ہے بچھو تمھارے پیروں کے نیچے کلبلاتے کلبلاتے ختم ہو جائیں گے۔

تم ڈرو نہیں، ڈرو نہیں ـــ غار کے اندر چلے جاؤ ـــ یہاں ایک اور آواز بلند کرو ـــ

"میں آگیا ہوں"

وہاں تمھیں ایک آواز سنائی دے گی،

"ہاں، تمھارا ہی انتظار تھا"

اس جملہ کے بعد تمھیں نزدیک بلانے کے لیے کہا جائے گا۔ خبردار! تم فوراً اس آواز کی طرف نہیں بڑھو گے۔ جہاں کھڑے ہو، وہیں زمین پر جھک جاؤ۔ ایک کنکر اٹھاؤ۔ جس طرف سے آواز آ رہی ہے۔ اسی طرف وہ کنکر اٹھا کر پوری قوت سے پھینک دو۔ ایک بھیانک قہقہہ تمھارے کانوں میں گھس پڑے گا۔ تم پوری تیزی سے پھر ایک کنکر اٹھاؤ۔ جس طرف سے قہقہہ کی آواز آ رہی ہے۔ اسی طرف دوسرا کنکر

پھینک دو۔ اب قہقہہ دوسری طرف سے تمھیں سنائی دے گا، پھر تم پوری تنہائی سے جھکو، تیسرا کنکر اٹھاؤ۔ اور جہاں سے قہقہہ بلند ہوا ہے۔ تیسرا کنکر پھینک دو۔ اب تمھیں دلفریب ہنسی سنائی دے گی، اسی طرح تم چوتھا، پانچواں، چھٹا اور جب تم ساتواں کنکر پھینکو گے تو ایک نسوانی آواز سنائی دے گی ــــ

"میرے صدیوں کے محبوب تم اب تک کہاں رہے !؟"

تم ایک قدم آگے بڑھو۔ تمھیں وہی نسوانی آواز والا سایہ نظر آئے گا۔ تراشا ہوا۔ پھر ایک قدم آگے بڑھو۔ تمھیں لگے گا کہ اس سایہ کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں ہے۔ اس کے بعد تم پھر ایک قدم آگے بڑھو گے۔ اب تمھیں سر کے بال گھٹنوں تک نظر آئیں گے۔ تمھارے ذہن میں ایک بوسیدہ اور فرسودہ تشبیہہ چلی آئے گی۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ تم ابھی ابھی سانپوں کے جنگل پار کرکے آگے بڑھے ہو۔ تمھارے منھ سے سانپ نکلے گا ــــ ہوشیار ! دراز زلفوں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ ہنسی کی آواز آئے گی۔ پھر تم پر تشبیہہ کی حماقتی گرفت مضبوط ہوگی۔ مدھر جھرنے کے پانی کی آواز آئے گی ــــ اس کے بعد شاعرانہ کمر نظر آئے گی۔ تمھاری آنکھوں میں فطری چمک پیدا ہوگی۔ اور یہی چمک بے پیے نشے کا اثر کر جائے گی۔ کولھے نظر آئیں گے، شہوت انگیز رانیں ــــ اس کے بعد تمھاری نظر اس کے پیروں کو نہیں چھو سکے گی ــــ شہوت انگیز رانیں، ہیجان خیز کولھے اور شاعرانہ کمر اپنے حصار میں لے لے گی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ تمھاری نظریں اوپر اٹھیں گی۔ اب وہ سایہ تمھاری طرف پشت کیے ہوئے نہیں کھڑا رہے گا بلکہ تمھارے سامنے ہوگا۔ تیز اور قیامت خیز جوبن۔ جلتے اور دہکتے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی اور پھیلی ہوئی آنکھیں اور جذبات آمیز ناف ــــ تمھاری حالت ماہیِ بے آب کی طرح ہوگی۔

یاد رکھو ــــ !

تمھیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ تم ایسا ویسا قدم نہیں اٹھاؤ گے۔

آواز .... آواز ...... آواز ...... آواز ....

چھم آؤنا ...... چھم ...... چھم ...... چھی چھی چھن ......

آگیا ہے کوئی جس کی تھی میں منتظر، ایک آہٹ پر نکل جاتا تھا دم، اس کی ہیں ....

مٹھیوں میں زمین آسمان ـــــ آگیا ہے وہی، ہاں ہاں وہی، ہاں ہاں وہی،

تم یہاں سے نہیں جاؤ گے، تم نہیں جاؤ گے۔ بس دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔ تم ایک قدم آگے بڑھو گے۔ یہاں سے تمھاری آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ دیوار ہوگی اور اس میں ایک سوراخ ہوگا اور تم اس سوراخ سے باہر دیکھو گے۔ یوں لگے گا کہ تمھاری پرچھائیں باہر نکل گئی ہے۔ لیکن تم باہر سانپوں کے بجائے آگ کا دریا اور بچھوؤں کی جگہ پانی کا سمندر ـــــ گھبراؤ نہیں ـــــ منظر بدلے گا ـــــ

تم جس راستے سے اندر غار میں داخل ہوئے ہو۔ اب اس راستہ کی طرف پشت کر کے غار کے دائیں طرف چلو، وہاں پر ایک بڑا سا پتھر ہوگا۔ اس پتھر کو ہٹا دو ـــــ اور زمین کے اندر دیکھو۔ وہاں ایک سیڑھی نظر آئے گی ـــــ تم اس سیڑھی سے نیچے اترو۔ آخری سیڑھی پر پانی ہوگا۔ تم تیرنا جانتے ہو۔ تیرتے ہوئے سیدھے آؤ ـــــ وہاں ایک روشن کھڑکی دکھائی دے گی۔ اس کھڑکی کے بائیں طرف کم از کم پندرہ منٹ تیرتے ہوئے آگے بڑھو۔ ایک آدمی کے برابر دروازہ نظر آئے گا۔ اس پر قفل لگا ہوگا۔ وہ زنگ آلود ہوگا۔ تم وہاں پانی میں ٹھہر سکو گے۔ قفل جلد نہیں کھلے گا۔ دروازے کے بازو ایک محراب ہوگا۔ وہاں چراغ

جل رہا ہوگا۔ اسی محراب میں چابی رکھی ہوگی۔ تم چراغ کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ ورنہ چراغ گرگٹ کی شکل میں تمھارے ہاتھ میں آئے گا۔ اور اگر چراغ بجھا ہو تب بھی تم چراغ کو ہاتھ نہیں لگاؤ۔ آہستہ سے اندھیرے میں ہاتھ بڑھاؤ ____ وہیں قریب میں ہی چابی ملے گی۔ گھبراؤ نہیں ____ چابی قفل میں گھماؤ ____ دھندلے دھندلے اجالے میں زنگ آلود قفل نہیں کھلے گا۔ چابی کو زور زور سے تین مرتبہ گھماؤ۔ قفل کھلے گا۔ قفل اور چابی وہیں رکھو۔ دروازے سے باہر آؤ۔ پلٹنے سے پہلے ہی دروازہ بند کردو۔ بغیر مڑے دو فرلانگ سیدھے ہی سیدھے چلتے رہو اور کچھ دیر رکو۔ پھر سانس سیدھی کرلو۔ یہیں کہیں ایک چبوترہ نظر آئے گا۔ اور اس چبوترے پر ایک بزرگ جن کی گھٹنوں تک بڑھی ہوئی داڑھی، آنکھوں کے بھوئیں اور سر کے بال سفید ہی سفید ہوں گے، وہ آنکھیں موندے، دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تسبیح کے منکے پھیرتے رہیں گے۔ تم وہاں جاکر خاموش کھڑے رہو گے۔ سفید ریش بزرگ کی آنکھ کھلے گی اور چاروں اور اجالا پھیل جائے گا۔

اور کیا ہوگا ____ ؟

اور کیا ہوگا ____ ؟؟

اور کیا ہوگا ____ ؟؟؟

اور ____

بچہ کہہ رہا تھا کہ میری دونوں مٹھیاں خالی ہیں۔

--

سفید پرندے

دیوار پر لگے گھڑیال نے صبح چھ بجنے کا اعلان کیا۔ آنگن میں نل کے پانی کے گرنے کی آواز آرہی تھی اور گھر کے باہر سے لوگوں کے چلنے پھرنے اور باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ لڑکا نیند سے بیدار ہوچکا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ اور سوجی ہوئی بھی تھیں۔ لڑکے کی نظر اپنے باپ پر پڑی۔ باپ ابھی سویا ہوا تھا۔ بیٹے نے باپ کے قریب جاکر پوچھا۔

" بابا، میں نے رات آنکھوں میں پرندوں کو دیکھا سفید سفید پرندے۔ ان پرندوں کا کیا نام ہوتا ہے ؟ بابا۔"

باپ لڑکے کی آواز سن کر کروٹ بدلتا ہے اور آنکھیں ملتا ہوا بستر پر بیٹھتا ہے اور کہتا ہے۔" پتہ نہیں بیٹا، رات تمھاری آنکھوں میں کون سے پرندے بسیرا کیے ہوئے تھے۔"

" میں نے کہا نا بابا، سفید رنگ کے پرندے۔"

" ہاں تو سمجھو وہ سفید پرندے کبوتر ہوں گے یا پھر بگلے۔" باپ کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔

" کبوتر! " بیٹے کے چہرے پر حیرت کے نشان اُبھرنے لگے۔

ہاں کبوتر یا بگلے ۔ باپ بستر پر سے تکیہ اٹھا کر کمر کو ٹیک لگاتا ہے ۔
وہ سفید پروں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے ۔ یادوں کی کشتیاں دور بہت دور اُس کے بچپن کے سمندر میں چلنے لگتی ہیں ۔ اس نے بھی اپنے باپ سے یہی سوال کیا تھا کہ بابا سفید پرندے ہمارے ساتھ میں کیوں نہیں آتے ؟ اس کے باپ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا ۔ مگر اسے اس وقت یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ ایسا کیوں کہا جا رہا ہے ۔
پھر ایک دن صبح ہی صبح آسمانوں پر کبوتر اُڑتے ہوئے نظر آئے اور شہر میں چاروں طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے ۔ اور یہ مسرت انگیز پیغام سُنایا گیا تھا کہ اب تم بھی سفید کبوتر اڑا سکتے ہو ۔ وہ اندر ہی اندر خوش ہوتا رہا ۔
— پرندے آزاد ہی رہتے ہیں —
ابھی وہ سوچ کے سمندر میں غوطے لگا ہی رہا تھا کہ بیٹے نے سوال کیا پرندے آسمان کے نیچے ہی کیوں اڑتے رہتے ہیں ؟
ہاں آسمان کے نیچے ہی اڑتے ہیں ۔ بیٹا وہ اپنی سوچوں کے غوطوں سے باہر نہیں آنا چاہتا تھا ۔ مگر بیٹے نے جواب سے غیر مطمئن ہو کر پھر پوچھا ۔
تو کیا رات کو وہ آسمانوں میں چلے جاتے ہیں ؟
نہیں بیٹا ، رات کو وہ کسی درخت پر بسیرا کر لیتے ہیں ۔ درختوں میں ان کے گھونسلے ہوتے ہیں ۔
نہیں بابا نہیں ۔ پرندے رات گھر نہیں جاتے بلکہ ہماری آنکھوں میں چلے آتے ہیں ۔ کیا آپ کی آنکھوں میں رات پرندے نہیں آتے ؟
باپ کچھ لمحے خاموش رہتا ہے ۔ ہاں ہماری آنکھوں میں پہلے سفید پرندے آیا کرتے تھے مگر اب نہیں آتے ۔ ہماری آنکھوں سے تمھاری آنکھوں میں جا بسے ہیں ۔

باپ اتنا کہہ کر بستر سے اٹھنا ہی چاہتا ہے کہ اس کی بیوی باہر آنگن سے کمرے میں داخل ہو کر، آج کا تازہ اخبار اس کی طرف بڑھاتی ہے اور بیٹے سے کہتی ہے۔

چلو بیٹا اب تم منھ ہاتھ دھو کر آؤ ــــ جلدی اٹھو۔ اتنا کہہ کر وہ اندر کمرے میں چلی جاتی ہے۔

بیٹا باپ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ماں کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیتا اور پھر باپ سے پوچھتا ہے۔ باپ کی نظریں اخبار کی سرخیوں پہ لگی ہوئی ہیں۔

ــــ طیارہ مار گرایا گیا۔

بولو نا بابا ــــ پرندے آنکھوں میں کہاں سے آتے ہیں ؟

پتہ نہیں کہاں سے آتے ہیں۔ کل تم نے اُڑتے ہوئے پرندے دیکھے ہوں گے۔ وہی پرندے تمھاری آنکھوں میں چلے آئے ہیں۔

نہیں بابا، پرندے ہماری آنکھوں میں آتے ہیں، ہاتھوں میں کیوں نہیں آتے ؟

تم پرندے پکڑنے کی کوشش نہیں کرتے۔

بابا، مجھے اُڑنا نہیں آتا، میرے پر نہیں ہیں۔

ہاں تمھارے پر نہیں ہیں۔

بابا جو لوگ پرندے پکڑتے ہیں کیا وہ ہوائی جہاز اُڑا کر پکڑ لیتے ہیں ؟

باپ کی نظریں پھر اخبار کی سُرخی کی طرف چلی جاتی ہیں۔

طیارہ مار گرایا گیا ــــ

کیوں بابا ہوائی جہاز پرندے کے جیسا ہوتا ہے نا ؟

ہاں پرندے کے جیسا ہوتا ہے۔ باپ نے زور دے کر کہا۔ اور کسی قدر

بیزاری سے۔ پھر وہ سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ ایک صبح سفید کبوتر اڑ گئے۔ اس وقت ہوائی جہاز بھی آسمانوں پر اُڑ گئے تھے اور اب .....

بٹیا باپ کی بیزاری کو دیکھتا ہوا خاموش ہو گیا اور بستر سے اٹھ کر ماں کے پاس چلا گیا اور ماں سے بھی وہی سوال کرنے لگا۔

دیوانہ بچہ! پرندے آنکھوں میں کیسے آتے ہیں۔ وہ تو دُور آسمانوں میں اڑتے ہیں۔ چلو جلدی منھ ہاتھ دھو لو۔ میں تمھیں رات میں چندا ماما کی کہانی سُناؤں گی۔

نہیں امّی! میں چندا ماما کی کہانی نہیں سنوں گا۔ ہاں امّی چندا ماما آسمانوں میں کیوں رہتا ہے، زمین پر کیوں نہیں آتا۔ اتنی دُور کیوں رہتا ہو؟

ماں غصّہ سے کہتی ہے۔ پہلے یہاں سے جاؤ اور منھ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاؤ۔ ناشتہ کر کے اسکول جانے کی تیاری کرو۔

بٹیا خاموش ماں کو تکنے لگتا ہے.... اور پرندے اس کی آنکھوں سے دور بہت دور چلے گئے ہیں۔

--

عقب کا دروازہ

بس یوں سمجھو کہ وہ ابھی کچھ ہی دیر میں آئے گا ۔ تم سب ہال اور کرسیاں صاف کر لو ۔ اس کے آنے کا یہی وقت ہے اور وہ وعدہ کرنے کے بعد مقررہ وقت پر ضرور آئے گا میں جانتا ہوں کہ آج اس کا دوسرا کوئی پروگرام نہیں ہے ۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا ۔

چپراسی ہال اور کرسیاں صاف کرنے میں لگے رہے اور وہ دھول کے اُڑنے کی وجہ سے اِدھر اُدھر ڈائس پر ٹہلنے لگا ۔

چپراسیوں نے کہا ۔۔۔ صاب تمام ہال اور کرسیاں صاف ہو گئیں ۔

صاحب نے کہا ۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے ۔ اب تم لوگ باہر لان میں مؤدب کھڑے رہو ۔

ایک چپراسی نے کہا ، مگر ہم صبح سے یہیں ہیں ۔ ابھی تک گھر نہیں گئے ۔ ہماری بیوی اور بچے ہمارے گھروں پر انتظار کر رہے ہوں گے ، اگر ہم اب گھر نہیں جائیں گے ، تو بیوی اور بچے سمجھیں گے کہ ہم نے ان سے خفا ہو کر سنیاس لے لیا ہے ۔ آج میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا ہے ۔ صاب میری بیوی صبح ہی صبح دروازے سے کراہ رہی تھی ۔ میں اس کو تنہا گھر پر چھوڑ کر آیا ہوں ۔ پتہ نہیں ، اب تک وہ

بچہ پیدا کر سکی یا نہیں۔ یا پھر کچھ اور ہوا ہوگا۔ وہ مجھے بخشے گی نہیں۔ مجھ پر رحم فرمائیے اور گھر جانے کی اجازت دیجئے۔ پتہ نہیں، بڑے ساب کب آنے والے ہیں۔

دوسرا چپراسی — اور صاحب، ہمیں بڑے صاحب کی تقریر سے کیا لینا ہے۔ آپ ہی ہمارے مائی باپ ہیں، آپ کا کہا، تھوڑی ٹال سکتے ہیں، ہم آپ کا حکم ہو اور بس کافی ہے۔ آپ کا پسینہ اور ہمارا خون حاضر ہے۔ صاحب۔ ہمیں اجازت دیجئے۔

صاحب نے کہا — کیا تم نہیں جانتے۔ تم اس وقت کس سے بات کر رہے ہو۔ کیا تم نے اپنی اوقات بھلا دی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا اور دیکھو اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اب تو میں تمھاری صورتیں بھی نہیں دیکھ رہا ہوں اور جانتے ہو۔ تمھاری صورتیں نظر نہیں آئیں گی تو میں تمھارے درمیان سے غائب ہو جاؤں گا۔ مناسب یہی ہے کہ تم بجلی جلاؤ۔ میرا تمھارے درمیان سے غائب ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم بے یار و مددگار رہ جاؤ گے۔ تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر جاؤ گے۔ میری مانو کہ میں ہی تمھاری نگرانی کرنے والا ہوں۔

تیسرا چپراسی — آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے۔ صاحب۔ آپ کے بغیر ہمارے زندہ رہنے کا کیا مطلب رہتا ہے اور آپ ہماری جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ پر صاحب ہماری بھی ایک بات ہے کہ میرے صبح گھر سے نکلتے وقت، میرا چھوٹا لڑکا بخار سے بلک رہا تھا۔ میں اس کی باتیں سن کر پریشان ہو گیا تھا اور جب سے اب تک میری آنکھوں میں اس کا چہرہ گھوم رہا ہے اور دماغ میں اس کی بے تکی باتیں گونج رہی ہیں۔ میں کیا بتاؤں صاحب وہ کہہ رہا تھا کہ "میں آنے والا یگ ہوں۔" اتنا ہی یاد رہ گیا۔ پتہ نہیں

بخار کی وجہ سے اور کیا کیا کہے جا رہا تھا۔ اس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں بہت پریشان ہوں سر۔

صاحب نے کہا — بے وقوفو! کیا تم نہیں جانتے کہ بڑا صاحب آ ئیگا تھئیں، یہاں نہ پا کر خفا نہیں ہوگا اور کیا تم نہیں جانتے کہ ایسے ہی وقت امتحان لیا جاتا ہے۔ تمھاری ترقی کے لیے اور تمھارے پیٹ کے ایندھن کا معقول انتظام کیا جا سکتا ہے۔ تم نہیں سمجھو گے تو ایک بڑے نقصان سے دوچار رہو گے۔

تینوں چپراسی ہاتھ باندھے گردن نیچی کیے کھڑے ہوئے ہیں اور صاحب اِدھر اُدھر ڈائس پر اپنی مٹھیوں کو بھینچے ہوئے ٹہل رہا ہے۔ ٹہلتے ٹہلتے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ روشنی کرو۔ روشنی کرو۔ روشنی کے بغیر میرا دم گھُٹ جائے گا۔ کیا تم نہیں چاہتے۔ میں کھلی فضا میں سانس لوں۔

تینوں نے ایک ساتھ کہا۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ آپ خود کھُلی فضا میں سانس لیں اور ہمیں بھی۔

صاحب نے کہا — کیا تم میری برابری کرو گے۔

ایک نے کہا — برابری نہیں۔ کم از کم کچھ وقت تو ہمارے ہاتھوں میں تھما دیجیے۔

اب پھر تینوں مودّب کھڑے ہیں۔ ہال میں خاموشی طاری ہے اور صاحب کرسی پر اِدھر سے اُدھر بے چینی سے دیکھ رہا ہے۔ اچانک کہہ اٹھا۔ "روشنی — روشنی تیز کر دو — میں مر جاؤں گا۔ اندھیرا بہت گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ تم سُن رہے ہو یا نہیں۔

تینوں میں ایک ساتھ حرکت پیدا ہوئی اور تینوں باہر جانے کے لیے اٹھے۔

صاحب نے کہا ــــ ٹھہرو۔ تم میں سے ایک ہی جاؤ اور بجلی کا بٹن آن کر دو۔

دو وہیں کھڑے رہے اور ایک وہاں سے باہر کی طرف جانے لگا۔ باہر آ کر بجلی کا بٹن ڈھونڈنے لگا۔ بٹن، پتہ نہیں، کہاں ہے؟ یہاں تو نہیں ہے۔ پھر کہاں ہوگا۔ ہاں یاد آگیا۔ اس عمارت کے عقب میں ہے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے چلنے لگا۔ اندھیرے میں صرف اس کے پاؤں کے چلنے کی آواز آرہی ہے وہ ہال کے عقب میں پہنچ گیا۔ اندھیرے میں اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہاں بھی بجلی کا بٹن نظر نہیں آرہا ہے ــــ اب صاحب ہی سے پوچھنا ہوگا۔ یہاں بجلی کے بٹن کا بورڈ کہاں لگا ہوا ہے ــ اچانک سامنے کے دروازے کی کھلنے کی آواز آئی۔ وہ گھبرایا ــ اور ایک زور کی چیخ ماری۔ ارے کوئی ہے ــ مجھے بچاؤ ــــ دوسرے ہی ثانیہ وہ سنبھلتا ہوا ہوش میں آیا۔ یہاں تو کوئی نہیں۔ میری تو چیخ ضائع ہو گئی۔ اب وہ آواز لگاتا ہے جس طرف سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ پوچھتا ہے کون ہے؟ کون ہو، تم ــ کہتے کیوں نہیں ......؟ ارے یہاں کون ہوگا۔ صاحب اور میرے دونوں ساتھی، وہاں ہال میں اندھیرا نگل رہے ہیں ہوا سے دروازہ کی آواز آئی ہوگی، مگر یہاں کہاں دروازہ ــ؟

عقب کا دروازہ ــ عقب کا دروازہ ــ عقب کا دروازہ ــ اس عمارت کے تمام دروازے سامنے کی طرف کھلتے ہیں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے اور آوازیں سنائی دیں۔

کرا ــ کرر ــ کر ــ کر ــ کرر ــ کرر ــ کرر ــ کرر
ک ــ ر ــ ک ــ ر

یہ آواز کہاں سے آرہی ہے! میں کہیں ہال والی عمارت سے باہر تو نہیں آگیا۔ اس عمارت کا دروازہ نہیں ہے۔ یہاں جنگل ہی جنگل ہے — اتنے میں، اُسے موٹر کار کی آواز سُنائی دی۔

شاید بڑا صاحب آگیا — اب مجھے ہال میں جانا ہی ہوگا۔ مگر بجلی کا کیا ہوگا۔ میں بغیر بجلی جلائے، وہاں کیسے جاسکتا ہوں — وہ مجھے شوٹ کر دیں گے۔ کیا کیا جائے؟

وہ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ہوا۔ سڑک پر چلا آیا۔ سڑک پر ایک آدمی تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا جارہا ہے۔

چپراسی نے پوچھا۔ ارے بھئی تم اتنی تیزی سے کہاں جارہے ہو؟

راہ گیر — مجھے جلدی ہوسٹل پہنچنا ہے۔ ورنہ ہوسٹل کا دروازہ بند ہوجائے گا۔ میں شہر میں گیا تھا۔ کچھ خریدنے کے لیے۔ آنے میں دیر ہوگئی۔ مجھے جلدی جانا ہے۔ نہیں تو مجھے عقب کے دروازے سے کمرے میں جانا پڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ وقت مقررہ پر پہنچ جاؤں۔ سامنے کا دروازہ کھُلا رہے گا — شہر میں کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ شہر میں کوئی بڑا صاحب آنے والا ہے۔ پتہ نہیں، کون آنے والا ہے۔

چپراسی — ہاں، ہاں، تم نے سچ سُنا ہے۔

راہ گیر — کب آنے والا ہے۔ بڑا صاحب

چپراسی ۔ بس اب آتا ہی ہوگا۔ ہمارا صاحب کہہ رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں آئے گا۔

راہ گیر۔ کچھ ہی دیر میں۔ کتنی دیر میں آئے گا۔ وقت مقرر نہیں کیا گیا؟

چپراسی — یہ نہیں بتایا گیا۔ اب کیا وقت ہورہا ہے؟

راہ گیر — وقت وقت — مجھے معلوم نہیں۔ میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔ اور بہت دیر سے شہر کے گھنٹہ گھر سے بھی آواز نہیں —

چپراسی — گھنٹہ گھر سے بھی آواز نہیں آئی۔

راہ گیر — ہاں سچ، میں نے بہت دیر سے کوئی آواز نہیں سنی۔ کیا آپ نے گھنٹہ کی آواز سُنی ہے؟

چپراسی — خیر، مجھے تو معلوم بھی نہیں ہے۔ گھنٹہ گھر کہاں ہے اور کب گھنٹہ بجتا ہے؟

راہ گیر — پھر تم وقت کیسے معلوم کر لیتے ہو؟

چپراسی — وقت کی کیا ضرورت ہے۔ بس یونہی سب کچھ چلتا ہے۔

راہ گیر — یونہی، یعنی تم اس سے بالکل بے خبر رہتے ہو۔

چپراسی — بس ایسا ہی سمجھو اور جان کر بھی کیا کرنا ہے۔ صاحب جب بلاتا ہے۔ ہم چلے آتے ہیں۔

راہ گیر — خیر ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔ اب تک تو سامنے کا دروازہ بند ہو گیا ہوگا۔ اب تو عقب کے دروازے سے ہی جانا ہوگا۔

چپراسی — عقب کے دروازہ سے! میں بھی اس عمارت کے عقب کے دروازہ سے ہی آرہا ہوں۔ وہاں بس صرف دروازہ کی آواز آرہی ہے مگر عقب کا دروازہ نہیں ملا۔

راہ گیر — یہ بھی خوب۔ عقب کا دروازہ ہر ایک کو ملنا ہو گیا!؟

چپراسی — اچھا —

راہ گیر — اچھا — میں چلتا ہوں۔

راہ گیر چلا گیا۔ چپراسی راہ گیر کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اب

وہ روشنی کی سڑک سے پیچھے کی طرف مڑا۔ میں ادھر سے ہی آیا تھا اور مجھے ادھر سے ہی جانا ہوگا۔ میرے ساتھی اور صاحب، میرا انتظار کر رہے ہوں گے، مگر میں وہاں جاکر کیا کہوں گا۔ وہ روشنی سے اندھیرے کی طرف چلا آیا۔ اس کو آہستہ آہستہ کسی کے چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ آواز قریب آتی جا رہی ہے۔ کاندھے سے کاندھا ٹکرایا۔ کون ہے۔؟

دوسرا چپراسی —— میں ہوں تمھارا ساتھی۔ میری آواز نہیں پہچانی؟

پہلا چپراسی —— کیسے نہیں پہچانا۔

دوسرا چپراسی —— ہال میں ابھی تک روشنی نہیں آئی۔ تم کہاں گئے تھے۔ ادِھر کیوں آئے ہو؟ بجلی کا بٹن —— وہیں لان میں دائیں بازو ہی میں ہے' نا —— کہاں گئے تھے تم؟

پہلا چپراسی —— میں بجلی کا بٹن ڈھونڈتے ڈھونڈتے' ادھر چلا آیا ہوں، کیا کہا —— لان میں ہی ہے۔ مگر مجھے دکھائی نہیں دیا۔ تم میرے ساتھ چلو۔ بتاؤ کہ بجلی کا بٹن کہاں ہے۔

دوسرا چپراسی —— خوب —— وہ کام تمھارا ہے۔

پہلا چپراسی —— پھر، تم کہاں جا رہے ہو۔؟

دوسرا چپراسی —— بجلی کا بٹن آن کرنے کے لیے۔

پہلا چپراسی —— پھر یہاں کیوں آئے ہو؟ لان تو پیچھے رہ گیا۔

دوسرا چپراسی —— پیچھے ہے!

پہلا چپراسی —— ہاں عقب میں۔

دوسرا چپراسی —— تم کہاں کہاں جا کر آ رہے ہو؟ وہاں صاحب غصہ ہو رہا ہے۔ ذرا سا کام ہے اور تم کب سے نکلے ہوئے ہو؟

پہلا چپراسی — کب سے نکلا ہوا ہوں۔
دوسرا چپراسی — ہاں وقت کیا ہوگا۔
پہلا چپراسی — وقت مجھے معلوم نہیں۔
دوسرا چپراسی — مجھے بھی معلوم نہیں۔
پہلا چپراسی — جانے دو۔ آؤ، میرے ساتھ، ہم صاحب سے کہہ دیئے گئے بجلی کا بٹن نہیں مل رہا ہے۔

ابھی دونوں قدم اٹھا ہی رہے تھے کہ ایک آواز آئی —

تیسرا چپراسی — کون ہو، تم لوگ —!؟
پہلا چپراسی — اور تم بھی چلے آئے ہو۔ کیا ہال میں صاحب اکیلا ہے؟
تیسرا چپراسی — پتہ نہیں۔ میں نے دیکھا نہیں۔ ہال میں گھپ اندھیرا ہے۔ میں نے کئی آوازیں دیں۔ مگر ایک بھی آواز کا جواب نہیں ملا۔
دوسرا چپراسی — کیا آج بڑا صاحب نہیں آئے گا؟
تیسرا چپراسی — اب تک تو نہیں آیا۔
پہلا چپراسی — وقت کیا تھا اس کے آنے کا؟
تیسرا چپراسی — وقت تو مجھے بھی معلوم نہیں، میرے ساتھیو۔
دوسرا چپراسی — پھر وہ کب آئے گا۔
تیسرا چپراسی — وہ تو ہمارے صاحب کو ہی معلوم ہوگا۔
پہلا چپراسی — چلو، چل کر صاحب سے ہی پوچھ لیتے ہیں۔

تینوں خاموش ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ دوسرے

چپراسی سے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ مگر تم نے کہا تھا تمھاری آوازیں دینے کے باوجود صاحب نے کوئی آواز نہیں دی ــــ!

تیسرا چپراسی ــــ ہاں، میں نے بہت آوازیں دی۔ صاحب، صاحب، پر آواز نہیں آئی۔

پہلا چپراسی ــــ کہیں عقب کے دروازے سے تو نہیں چلا گیا۔

تیسرا چپراسی ــــ عقب کا دروازہ!

دوسرا چپراسی ــــ یہ کیا ہوتا ہے۔ عقب کا دروازہ۔

پہلا چپراسی ــــ مجھے بھی معلوم نہیں ــــ

دوسرا چپراسی ــــ پھر، تم نے عقب کا دروازہ کیسے کہا؟

پہلا چپراسی ــــ ہاں ہاں، ابھی ایک راہ گیر ملا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مقررہ وقت پر ہوسٹل نہیں پہنچے گا، تو سامنے کا دروازہ بند ہو جائے گا اور عقب کے دروازے سے جانا ہوگا۔

تیسرے چپراسی نے شاید سوچتے ہوئے پوچھا۔ عقب کا دروازہ کیا ملا ہے؟

پہلا چپراسی ــــ دیکھو یہ رہا لان۔ بائیں بازو دیکھو۔ بجلی کا بٹن ہوگا۔

دوسرا چپراسی ــــ ہاں ہاں دیکھ لو۔ جلدی سے بجلی جلاؤ اور صاحب کی اجازت لے کر چلتے بنو۔ بڑے صاحب سے ہمارا کیا کام ہے۔

تیسرا چپراسی ــــ ہاں ٹھیک ہے، پہلے بٹن آن کر دو۔

اب تینوں ادھر اُدھر بٹن ڈھونڈتے ہیں، لیکن بٹن نہیں ملا۔ تینوں کی سانسیں تیز تیز چل رہی ہیں۔ اس دوران میں ایک دوسرے سے ٹکراتے بھی رہے ہیں۔ تینوں دم چھوڑتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پہلا چپراسی — یہاں بٹن ہے اور نہ روشنی۔
دوسرا چپراسی — تم نے سچ کہا تھا۔
تیسرا چپراسی — چلو، ہال میں جا کر دیکھتے ہیں، صاحب ہے یا چلا گیا۔

تینوں ہال میں داخل ہوتے ہیں اور تینوں ایک ساتھ مل کر آواز لگاتے ہیں، لیکن جواب ندارد —

دوسرے چپراسی نے تیسرے چپراسی سے کہا۔ ارے تم بیڑی پیتے ہو نا، تمھارے پاس ماچس ہوگی، تیلی جلاؤ —

تیسرے چپراسی نے کہا۔ ہاں تیلی جلاتا ہوں، تیلی جلاتا ہوں۔
پہلے چپراسی نے تیسرے چپراسی سے سوال کیا۔ تم نے اب تک تیلی کیوں نہیں جلائی؟

تیسرا چپراسی۔ میں سوچتا تھا کہ کہیں صاحب بیڑی پیتا نہ دیکھ لے۔
دوسرا چپراسی — یہ کیوں نہیں کہتا کہ بھول گیا تھا۔
پہلا چپراسی — ہاں بھول گیا تھا نا۔ ارے یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ پھر صاحب کہاں چلا گیا۔

دوسرا چپراسی — چلو وہاں ڈائس پر دیکھ لیتے ہیں اور وہاں ٹیبل پر کاغذ نظر آرہا ہے۔
تیسرا چپراسی کہنے لگا۔ دیکھو اب راستہ کا اندازہ ہوگیا ہے۔ ڈائس تک چلو۔ ہاں یاد رکھو میرے پاس صرف دو تیلیاں ہیں۔ کاغذ پر کیا لکھا ہے۔ چلو، جلدی جلدی چلو —
تینوں تیزی سے ڈائس پر چلے آئے۔ تیسرے چپراسی نے

تیلی جلائی۔ پہلے چپراسی نے کاغذ کو دیکھا۔ وہ ایک دم کورا تھا۔
لیکن ڈائس کے عقب والا دروازہ کھلا تھا۔ تینوں ایک دوسرے
کی صورت دیکھنے لگے اور دھڑام سے وہیں گر پڑے۔ عقب کا دروازہ

--

شاہ جو کی چاندنی

اور

زمین کی گمشدگی

مرد نے چاروں اور دیکھا۔ ہر طرف خاموشی اور ویرانی کی حکومت تھی۔
مرد اپنی آنکھوں میں ہر طرف وقت کی تیز دھار کو دیکھ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وقت آسمانوں اور میرے تمام شریر میں رچ بس گیا ہے۔ مرد محسوس کرتا ہے اُسے تیز گام چلنا ہی ہوگا مگر اس کی آنکھوں میں لال لال ڈورے کیوں نظر آرہے ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ مرد آہستہ سے بڑبڑاتا ہے۔

مرد کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہے۔ بیوی اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرتی ہے مگر کیا خود عورت کو بھی معلوم نہیں اور مرد عورت کی آنکھوں میں صرف اور صرف چاندنی دیکھنے کے لیے بے قرار ہے۔

عورت، مرد سے کچھ قدم دور چلتی ہوئی آتی ہے اور دور آسمانوں میں گرد اور دھول کو دیکھتی ہے اور مرد کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں اور وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے ایسا لگتا ہے وہ دور آسمانوں میں نجات کا راستہ تلاش کر رہا ہو — مگر کیوں — زندہ لوگوں کو نجات کی کیا ضرورت ہے۔

عورت مرد سے پوچھتی ہے "تم آسمانوں میں کیوں دیکھ رہے ہو زمین پر کیوں نہیں دیکھتے۔"

مرد جواب دیتا ہے۔ "دیوانی آسمانوں سے ہی قہر نازل ہوتے ہیں۔"

عورت اپنی ساڑی کا پلو ٹھیک کرتی ہوئی کہتی ہے۔ "پھر تم آسمانوں میں کیوں گھور رہے ہو؟"

مرد کہتا ہے۔ "تم خاموش رہو تم کچھ نہیں جانتیں۔ خاموش رہو۔"

مرد کی آنکھوں میں ویران سناٹا۔ مرد کو اس کا شدید احساس ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی آنکھوں میں چاندنی دیکھنے کے باوجود خاموش ہے۔

چند لمحوں کے بعد فضا میں دھول، گرد، دھواں چاروں طرف دیکھ کر مرد کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔

عورت پوچھتی ہے "یہ دھول گرد اور دھواں کہاں سے آ رہا ہے؟"

مرد بیزاری سے کہتا ہے۔ "آسمانوں سے۔"

عورت کسی قدر ناراض ہوتی ہوئی کہتی ہے۔ "کیا تمھیں آسمان کے علاوہ کوئی اور چیز نظر آ رہی ہے؟"

مرد صرف "ہاں" کہتا ہے۔

"نہیں شاہ جو تم غور کرو دھول گرد اور دھواں زمین سے اٹھ رہا ہے تم غور کرو آسمانوں سے نہیں۔" عورت شاہ جو کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے پھر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگتی ہے اور کان کے قریب جا کر کچھ کہتی ہے۔

شاہ جو۔ "نہیں میری چاندنی ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔"

چاندنی۔ "ہاں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ میری سماعت دیکھو میں کس قدر تیز تیز قدموں کی آواز سن رہی ہوں۔"

شاہ جو — "نہیں چاندنی تمھاری سماعت میں زمین گردش کر رہی ہے"
چاندنی — "ہاں شاہ جو میری سماعت میں زمین گردش کر رہی ہے کیا تم آوارہ بادلوں میں گھومتے رہو گے اور کب تک؟"
شاہ جو — "دیوانی! دیوانی!! دیوانی — میں زمین پر ہی کھڑا ہوا ہوں، میری چاندنی، میری رانی دیکھو تو سہی —"
چاندنی — "مگر شاہ جو زمین پر کھڑے ہو کر تم آسمانوں میں کیوں دیکھ رہے ہو زمین کو دھرتی کے روپ میں دیکھو کتنی رنگین ہوتی جا رہی ہے، چاروں طرف لال رنگ ہے۔ تم بتاؤ یہ رنگ کون سا ہے اور کس کا ہے؟ شاہ جو، ہے نا، لال رنگ — ہاں شاہ جو لال رنگ، دیکھو اپنی آنکھیں کھول دو —"
شاہ جو — "تم نے کچھ دیر پہلے کہا تھا تم سماعت میں دیکھ رہی ہو! تمھاری آنکھوں میں چاندنی ہے، چاندنی، میری چاندنی —"
چاندنی — "تم تو آنکھوں سے دیکھ رہے ہو نا — دیکھو، غور سے دیکھو۔ میری سماعت میری کوکھ میں دھنستی جا رہی ہے —"
شاہ جو — "چاندنی۔!"
چاندنی — "شاہ جو مجھے بچاؤ، میری سماعت میرے پیٹ میں داخل ہو رہی ہے میرے شاہ جو کیا میں اس سماعت کو کوکھ میں لیے لیے ہی ختم ہو جاؤں گی —"
شاہ جو، چاندنی کے قریب آکر اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھتا ہے اور زور زور سے ہنسنے لگتا ہے کچھ دیر کے بعد بلند آواز سے کہتا ہے "ارے تم تو، تم تو ماں بننے والی ہو دیکھو مجھے بچے کے رونے کی آواز آرہی ہے —"
چاندنی — "نہیں شاہ جو نہیں — تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ میرے پیٹ

میں بچہ نہیں ہے مجھے چاروں طرف لال رنگ، دھواں دھواں اور گرد نظر آ رہی ہے۔ میری سماعت گویا ہو رہی ہے"

شاہ جو "ارے تم کیا کہہ رہی ہو کہیں سماعت بھی گویائی کی طاقت رکھتی ہے۔"

چاندنی "دیکھو شاہ جو، میں تھکی جا رہی ہوں"

شاہ جو "ارے تمھاری ممتا کا کیا ہو رہا ہے؟"

چاندنی "نہیں شاہ جو میری ممتا کو لال رنگ ہی نظر آ رہا ہے"

شاہ جو "چلو یہاں سے کسی اور جگہ چلے جائیں گے۔ مگر کہاں! چاروں طرف ایک ہی جیسا منظر ہے — ہاں چاندنی، تم اپنے پیٹ کو پوری قوت سے پکڑ لو تمھارا بچہ گم نہ ہو جائے۔ چاندنی دیکھو تو میری آنکھیں، میری آنکھیں تمھارے لیے ہیں"

چاندنی "ہاں شاہ جو تمھاری آنکھیں میرے لیے ہیں ذرا تم میری آنکھوں میں دیکھو"

شاہ جو "تمھاری آنکھوں میں چاندنی ہے اور ممتا —"

چاندنی "نہیں شاہ جو دھرتی میرے قدموں سے سرکنے لگی ہے ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ شاہ جو کہو تو —"

شاہ جو "ارے تمھیں وہم ہو گیا ہے۔ چاندنی —"

چاندنی "نہیں شاہ جو، دیکھو تو —"

چاندنی کی آنکھوں میں غنودگی ہے اور سر چکرانے لگا ہے۔ اور وہ دھیرے دھیرے بولنے لگتی ہے۔

"شاہ جو — شاہ جو — شاہ جو"

شاہ جو :- کیا ہوا؟ میری چاندنی، تم ادھر آؤ، اس طرف، درخت کے نیچے لیٹ جاؤ، کچھ دیر آرام کرو۔"

شاہ جو خود بھی چاندنی کی طرف بڑھتا ہے۔ چاندنی خاموش شاہ جو کے کاندھوں پر سر رکھ کر آہستہ آہستہ چلنے لگتی ہے اور شاہ جو چاندنی کو درخت کے نیچے بٹھا دیتا ہے اور پھر درخت کے نیچے زمین صاف کر کے کہتا ہے۔

"چاندنی لیٹ جاؤ۔ تمہارے آرام کرنے تک، میں یہیں بیٹھا تمہارے جاگنے کا انتظار کروں گا۔" چاندنی لیٹ جاتی ہے اور اس کا بایاں ہاتھ اس کے پیٹ پر ہے اور دایاں ہاتھ اس کے بائیں کان پر۔ مگر وہ پھر زور سے چیختی ہے۔

"نہیں شاہ جو، میری سماعت تیز تر ہوتی جا رہی ہے میری سماعت کو ذرا سنو۔"

شاہ جو :- کیا کہہ رہی ہو، چاندنی۔ میری سماعت کہاں؟"

چاندنی :- تمہاری سماعت نہیں! شاہ جو میری..... مجھ پر ذرا رحم کرو۔"

چاندنی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔

شاہ جو :- چاندنی، چاندنی، چاندنی خاموش ہو جاؤ خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ کوئی ادھر آ کر سن لے تو کیا ہوگا۔ چاندنی کی آنکھوں میں آنسو کیوں؟"

چاندنی :- "نہیں شاہ جو نہیں سب ہی کچھ وہی ہے۔"

شاہ جو :- کیا تمہاری بینائی بھی چلی گئی ہے؟ تم ذرا غور سے دیکھو، دیکھو۔"

چاندنی :- نہیں شاہ جو زمین چکرا رہی ہے۔"

شاہ جو :- چاندنی نہیں تمہارا سر چکرا رہا ہے تم ذرا آرام کرو۔

چاندنی ” نہیں شاہ جو تم کیا سماعت اور بینائی سے محروم ہو گئے ہو ؟ دیکھو میرا جسم گرم ہوتا جا رہا ہے۔ کیا میں ..... کیا میں .....“

شاہ جو ” کچھ نہیں ہوگا چاندنی تم ایک چاند سا بیٹا جنم دو گی “

چاندنی ” نہیں شاہ جو میں حاملہ نہیں ہوں، لگتا ہے زمین حاملہ ہو گئی ہے۔

شاہ جو ” چاندنی اب بس کرو۔ مجھے اس مت کرو اور لیٹ جاؤ تم میرے ہونے والے بچّہ کو ختم کر دو گی ۔“

چاندنی ” نہیں شاہ جو میں حاملہ نہیں ہوں “

شاہ جو ” پھر، پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے چاندنی، چاندنی تمھاری آنکھیں کہاں ہیں ؟“

چاندنی ” کیا کہہ رہے ہو شاہ جو، میری آنکھیں بھی تمھیں نظر نہیں آ رہی ہیں ؟ کیا تم نے سچ مچ اپنی بینائی کھو دی ہے ؟ شاہ جو “

شاہ جو ” سنو ! چاندنی میری بینائی تمھاری آنکھوں میں ہے۔ میں صرف اور صرف تمھیں دیکھ سکتا ہوں “

چاندنی ” ایسا نہیں ہے، شاہ جو، دیکھو لوگ بھاگ رہے ہیں “

شاہ جو ” کس دِشا میں ؟“

چاندنی ” بے دِشا ہی “

شاہ جو ” بے سمت ہی بھاگے جا رہے ہیں لیکن کیوں ؟“

چاندنی ” تم خود کیوں نہیں دیکھتے ہو “

شاہ جو ” ہاں میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا، چاندنی — تمھیں وہم ہو رہا ہے “

چاندنی ” مجھے وہم نہیں ہوا تم دھول، دھواں اور گرد نہیں دیکھ سکتے “

شاہ جو ” نہیں چاندنی ایسا نہ کہو “

مارو — بھاگو — تیز بھاگو

چاندنی :— "دیکھو شاہ جو، وہ بڈھا بھاگ رہا ہے اس کے ہاتھ سے اس کی چھڑی گر گئی ہے۔ ارے دیکھو وہ عورت پیٹ کو دبائے ہوئے بھاگ رہی ہے۔ تم اسے پکڑ کر لاؤ — شاہ جو، یہاں درخت کے نیچے آرام کرے گی۔ دیکھو تو سہی وہ بچہ روتا ہوا ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے اور وہ بھی تمہاری طرح آسمانوں میں دیکھ رہا ہے۔ وہاں کیا ہوتا ہے، آسمانوں میں؟ شاہ جو :—

شاہ جو :— مگر یہ سب کچھ تمہیں کہاں دکھائی دے رہا ہے؟ چاندنی"

چاندنی :— میں عورت ہوں اور تم مرد، عورت جسم کے ایک ایک حصہ سے دیکھ لیتی ہے، شاہ جو کیا سچ سچ تم کچھ نہیں دیکھ رہے ہو؟"

شاہ جو :— اب بس کرو تمہاری بکواس سے میرا سر پھٹا جا رہا ہے چاندنی"

چاندنی :— میں اور دھرتی ماں۔ ماں — یہ رنگ نہیں خون ہے شاہ جو خون :—

شاہ جو :— مگر کس کا؟" چاندنی یہاں تو تم اور میں ہی ہیں"

چاندنی :— تم کیا کہہ رہے ہو اتنے سارے لوگ بھاگ دوڑ رہے ہیں تمہیں کچھ نظر نہیں آرہا ہے"

شاہ جو :— مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے تا حدِ نظر خاموشی، سنّاٹا اور جنگل"

چاندنی :— نہیں شاہ جو نہیں یہاں لوگ بھاگ رہے ہیں بے سروسامان کوئی کسی کا نہیں ہے۔ بڈھا گر گیا ہے اور عورت اپنے پیٹ کو پکڑے رو رہی ہے اور بچہ کبھی آسمانوں میں اور کبھی زمین کو دیکھ رہا ہے تم دیکھو شاہ جو"

شاہ جو :— "سچ مانو چاندنی میری آنکھوں میں صرف چاندنی ہے اور سماعت

میں تمھاری دل کش آواز"

چاندنی ــــ "وہ وقت گزر گیا ہم بہت دور آگئے ہیں۔ تم ابھی پہلی رات

کے منظر میں محو ہو"

شاہ جو ــــ "ہاں چاندنی میں اس ایک منظر میں محو رہنا چاہتا ہوں"

چاندنی ــــ "مگر یہ کیسے ممکن ہے شاہ جو دن رات گذرتے رہتے ہیں"

شاہ جو ــــ "لیکن چاندنی مجھے وہی منظر چاہیے"

چاندنی ــــ "یہ ممکن نہیں شاہ جو ممکن نہیں"

چاندنی زور سے چیختی ہے "سنو کتنی بھیانک آوازیں آرہی ہیں کیا سُن

رہے ہو۔ شاہ جو، نکلو پہلی رات کے منظر سے"

آوازیں ــــ آوازیں ــــ آوازیں۔

بھاگم بھاگ ..... بھاگم بھاگ ..... بھاگم بھاگ ....

"پھر تم آسمانوں میں گھور رہے ہو شاہ جو ــــ"

شاہ جو ــــ "نہیں میں آسمانوں میں نہیں، چاندنی کو تلاش کر رہا ہوں"

چاندنی ــــ "اب شاید یہ ممکن نہیں"

..... بچہ بھاگ رہا ہے۔ آوازیں قریب آرہی ہیں۔ دیکھو اس بچہ کو

کر لے آؤ کہیں گم نہ ہو جائے۔

شاہ جو ــــ "مگر وہ بچہ تو تمھارے کوکھ میں ہے، چاندنی"

چاندنی غصہ سے بھری ہوئی ہے تیز آواز سے شاہ جو سے کہتی ہے۔

"کیا تمھیں صرف میرا بچہ ہی نظر آرہا ہے وہ بچہ ــــ وہ بچہ ــــ بھاگ

ہے۔ دیکھو اس کے پیر لڑکھڑا رہے ہیں ..... وہ دیکھو عورت کی سانس بجھ

رہی ہے۔ زار و قطار رو رہی ہے۔ اس کا پیٹ آہستہ آہستہ کم ہوتا نظر آرہا

شاہ جو :۔ نہیں چاندنی تم اپنے پیٹ کو دیکھو، کتنا بھرا بھرا لگ رہا ہے
تم چاند جیسا لڑکا جنم دو گی "
چاندنی :۔ شاہ جو ذرا سمجھنے کی کوشش کرو "
شاہ جو :۔ کیا کہا ؟"
چاندنی :۔ میری آنکھ ـــ ہاں میری بینائی تیز اور تیز ہے۔ زندہ ہے
وہ بوڑھا بھی زندہ ہے زمین پر لیٹا ہوا ہے "
شاہ جو :۔ چاندنی تم ہوش میں تو ہو نا "
چاندنی ـــــ " شاہ جو میں پوری طرح ہوش میں ہوں "
وہ بڈھا بے دم ہو گیا ہے۔ تم اس کے لیے پانی تلاش کر کے لے آؤ۔
اور اس کے حلق میں ڈال دو اور اس بچہ کو اِدھر لاؤ ـــ اور عورت کو اِدھر لاؤ،
درخت کے نیچے "
درخت ساکت، دھول دھواں اور گرد چاروں طرف ـــ
"چاندنی تم کہاں ہو ـــ ؟ درخت کہاں ہے ـــ ؟ کہیں نہیں، دیکھو میں
آیا ہوں ـــ پانی لایا ہوں "
"مگر وہ بوڑھا ـــ !"
" اور وہ عورت ـــ !!"
" اور اور وہ بچہ ـــ !!!"
"چاندنی میں یہاں ہوں، تم خاموش کیوں ہو تم نے کہا تھا نا میری
آنکھیں بینائی کھو چکی ہیں ایسا ہرگز نہیں۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں "
چیخیں، آوازیں، آوازیں،
"شاہ جو، شاہ جو، شاہ جو تم کہاں ہو میری بینائی کو کیا ہو گیا ـــــ

میری سماعت تیز تر ہوتی جارہی ہے تم سُن رہے ہو۔ شاہ جو۔"

"میں کہاں ہوں — چاندنی — اور تم — ا؟"

"..... ایسا کیوں ہو رہا ہے — !!"

"تم تم شاہ جو — کیا تمھاری بینائی کھو گئی ؟"

"نہیں چاندنی میں تمھاری دل کش آواز سُن رہا ہوں۔"

"کیا تم اس بڈھے، عورت اور بچے کی آواز سُن رہے ہو؟ شاہ جو!"

ارے تم کون سی بات کر رہی ہو۔ تمھیں کیا دکھائی دے رہا ہے؟ تمھاری بینائی ختم ہو گئی ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے صرف تم اور صرف میں اور چاروں طرف سناٹا۔ کہاں ہو، چاندنی — کہاں ہو — میرے قریب آؤ — یہاں کوئی نہیں ہے۔ شرماؤ نہیں — قریب آؤ — یہاں کوئی نہیں ہے — تمھاری کوکھ میں بچہ ہے نا — "دیکھو ادھر آؤ — میں تمھارے پیٹ میں جینے والے بچے کی آواز سُن رہا ہوں — کہاں ہو، چاندنی، کیا میری آواز نہیں سُن رہی ہو؟ چاندنی میرے قریب آؤ — کیا کہا۔ میری سماعت — میں سُن رہا ہوں — خاموشی — اور دیکھ رہا ہوں — سناٹا — اب کیا ہو گا —"

شاہ جو ایک سمت چلتا ہے، پھر رکتا ہے۔ "میں کدھر جاؤں — چاندنی کس طرف ہے — میں کہاں جا رہا ہوں — چاندنی دیکھو، میرے پاس آؤ — ہر طرف لوگ سوئے ہوئے ہیں آرام سے — مگر میری ناک کو کیا ہو گیا ہے — میری ناک — میں مر جاؤں گا۔

"میری ناک کو کیا ہو گیا، چاندنی — چاندنی کیا تم بھی سو گئی ہو —؟

"مگر میرا بچہ تمھاری کوکھ میں جی رہا ہے — کیا کہا — وہ سو گیا۔

"نہیں چاندنی ایسا نہ کہو — ہاں چاندنی لال رنگ، چاروں طرف لال رنگ۔

ارے یہ کیسی آوازیں ۔ اور کون کس دشا میں بھاگ رہا ہے۔ کیا چاندنی تم نے میرے بچہ کو جنم دے دیا؟ چاندنی کیوں خاموش ہو ــ چاندنی۔ چاندنی۔"

شاہ جو ادھر اُدھر دیکھتا ہے وہ آسمانوں کی طرف نہیں دیکھ رہا ہے مگر اس کی آنکھوں کے سامنے صرف خاموش ماحول ہے۔ مگر یہ کیسی آواز ــ ٹھا ــ ٹھا ــ ٹھا ــ ٹھا ٹھا ــ ٹھا

"کون ـــــ؟"

"کون ہو ــ؟؟"

"کون ہو بتاتے کیوں نہیں ــ؟؟؟"

ارے یہاں کوئی نہیں ــ

"کیا مری چاندنی ــ ماضی بن گئی ــ!؟"

"اور آنے والا بچہ ــ کھو گیا ــ!!؟؟"

"اور میں یہاں کیا کر رہا ہوں ــ؟"

شاہ جو کو زمین گھومتی ہوئی نظر آرہی ہے

"نہیں چاندنی نہیں تم نے دھوکہ کیا ــ نہیں ..... نہیں ..... نہیں ....."

شاہ جو لڑکھڑا کر گرتا ہے۔

پورا پس منظر دھول، دھویں اور گرد سے بھرا ہوا ہے اور چاروں طرف زمین لال رنگ سے رنگی ہوئی ہے۔

مرد خاموش ہے ــ

اور عورت درخت کے نیچے بے خبر پڑی ہوئی ہے۔

ــ ــ

برزخ

راشد جس کی آنتیں زنگ آلود ہو چکی ہیں، دواخانے کے اسپیشل وارڈ میں پلنگ پر دراز ہے۔ اور کئی ذہنی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ وقفہ وقفہ سے چیختا ہے۔ طرح طرح کی باتیں سوچتا ہے۔ چیخیں بہت دیر تک سنبھال نہیں سکتا۔ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگتا ہے۔ "یہ زمین، آسمان، چاند، سورج، تارے پہاڑ، سمندر، ندی، جانور، چرند، پرند، مشین، بلڈنگیں اور لوگ بس جی رہے ہیں۔ انھیں زندگی لفظ ورثہ میں دیا گیا ہے۔ ان کا کام بس جیتے رہنا ہے۔ چھٹکارا ناممکن" وہ سوچتے سوچتے تھک رہا ہے۔ ہاتھ پیر اکڑتے جا رہے ہیں۔ ایک چیخ مارتا ہے۔

"اے پاک پروردگار ——" اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔

پہلے اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ اس کی آنتیں زنگ آلود ہو چکی ہیں جن کو چند گھنٹوں کے بعد ڈاکٹر صاف کر دے گا۔ اس کی آنتیں صاف ہو جائیں گی پھر وہ ہر چیز کو ہضم کرنے کی صلاحیت رکھے گا۔ تاکہ جیتا رہے۔ لیکن ابھی ابھی رپورٹ ملی ہے کہ اسے کوئی دماغ کی بیماری ہوئی ہے۔ زہریلے جراثیم کمر سے ہوتے ہوئے دماغ میں چڑھنے لگے ہیں۔

آج صبح سر کا ایک بال کھوپرے کے تیل سے چپچپا، غلطی سے اس کے حلق میں پھنس گیا تھا۔ صبح صبح یہ کیا ہوگیا۔ پسلیاں منھ کو آنے لگیں۔ ایک قے ہوئی اور بال حلق سے باہر نکل آیا۔ "مسلسل تباہی ـــ میں جینا نہیں چاہتا"

پھر اس نے زور کی ایک چیخ ماری ـــ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معدہ بھی شعوری انداز سے جاگ رہا ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا کہ مزید غذا، اس کے معدہ میں چلی جائے۔ اب بہت ہوگئی غذا ـــ اب بھوکا ہی رہنے دو۔ اس کا معدہ گرمی سے اُبلنے لگا ہے اور وہ اب خاموش ہوگیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اس کی آنکھیں مسلسل چھت میں پھنسی ہوئی ہیں۔ اس کو کچھ باتیں سنائی دے رہی ہیں۔

..... اس کی کمر میں ایک نشتر لگانا ہوگا اور یہاں سے پیپ نکلے گی۔ اس کو فوراً بے ہوشی کا انجکشن لگایا جائے۔

اس کے چہرے پر منفی اور مثبت لکیریں اُبھرنے لگی ہیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے جسم کو تقسیم کر دیا جائے، یا کسی اعشاریہ کا اضافہ کیا جائے۔ اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا ہے۔ وحشت کا لامتناہی خط پورے جسم میں کھنچ گیا ہے۔ آنکھوں میں آپریشن کے ہتھیار گھوم رہے ہیں۔ دماغ ضرب کا شکار ہوگیا ہے۔ ضرب کو اس نے نامعلوم طریقہ سے اپنے میں پیوست کر لیا ہے۔ پھر بھی اس سے نجات کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن علامتوں سے چھٹکارا ناممکن ـــ پھر.....

پھر سوچتا ہے۔ یہ آلات اور ہتھیار نہ جانے کس زمین سے برآمد ہوئی دھات کے بنائے گئے ہیں اور کون سے ضابطے کے تحت بگڑے ہوئے ہیں۔ دماغ بالکل ضرب زدہ ہو چکا ہے۔ ضرب کے عمل سے لاحاصل مختلف وجوہ ہیں۔ ضرب جس نے عمل کو مسلسل جاری رکھا ہے۔ یہ ہتھیار اور آلات غیر مرئی ہیں، اور ایک

جسمی نظام کو جو بریکٹ میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کو اعشاریہ، ٹھوس، ضابطہ کے ذریعہ کھول دینا چاہتے ہیں اور یہ زمین جو ہمارے لیے بنائی گئی ہے۔ اس قسم کی فضولیات کو جنم دیتی ہے ـــ تعجب!

ضرب کے عمل سے مختلف قسم کے سوالات پیدا ہونے لگے ہیں۔ یہ کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ نفرت انگیز عمل، جو ازل سے چلا آرہا ہے۔

اس کو پورا دواخانہ نفرت کے دھوئیں میں ڈوبا ہوا نظر آرہا ہے۔ اور یہاں کا ہر فرد جسم کو چھلنی کرنا چاہتا ہے اور ساتھ میں احسانمندی کا لفظ، اس ذہن میں پیوست کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اس ماحول سے جتنی جلد ہو سکے بھاگنا چاہتا ہے۔ اس کا جسم شیشم کی مانند ہونے لگا ہے۔

وہ پھر چیختا ہے ـــ "اے پاک پروردگار ـــ" یہ سچ ہے کہ آدمی جب ضرب زدہ شکل اختیار کر لیتا ہے تو ایک طاقت کو پکڑنا چاہتا ہے۔ اس کی آنکھیں کھڑکی سے باہر نیلے آسمان کو دیکھ رہی ہیں۔

ڈاکٹر نے ہدایت دی ہے کہ وہ خاموشی سے پلنگ پر آرام کرے۔ مگر اس کے لیے یہ ممکن نہیں۔ وہ کراہ رہا ہے۔ اور اپنی آنکھیں چند ثانیہ کے لیے بند کر لیتا ہے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولتا ہے۔ اس کے دیدوں میں میل خوردہ چھپکلی رینگ رہی ہے۔ وہ زور زور سے کہہ رہا ہے۔

"موت تو آجا ـــ اور، اور میرے جسم میں داخل ہو جا، میں آج تیری عظمت کو خود میں جذب کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے میں نے عظمت کے روپ میں بہت سے راکھششوں کو دیکھا ہے۔ لیکن تو راکھشش نہیں۔ تو تمام احساس کا مداوا ہے۔ میرا جسم سڑ جائے گا کیونکہ میرے جسم میں بیمار جراثیم سرایت کر رہے ہیں۔ سارا ماحول گندہ ہو جائے گا۔ اور میرے پاس کوئی بھی آنا گوارا نہیں

کرے گا۔"

اپنی نظروں کو اطراف میں گھماتا ہے، ماحول سانسوں اور ہچکیوں سے تنگ ہوتا جارہا ہے۔ پھر وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ پورا جسم آئینہ بن گیا ہے، اور ہونٹ تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد، اس کے پیروں میں حرکت ہونے لگتی ہے۔ آنکھیں کھولتا ہے۔ نفرت سے تیز چیخ مارتا ہے۔

"مجھے اکیلا رہنے دو، میں اکیلا ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

پھر ایک چیخ مارتا ہے ـــ "اے پاک پروردگار ـــ" میں تجھ سے چاہوں گا کہ میری آخری سانس کے وقت کسی بھی چہرے کو میرے سامنے نہ رکھو۔ میں نے انھیں بارہا دیکھا ہے۔ میں انھیں خوب جانتا ہوں۔"

پھر اس کی آنکھوں کے سامنے کھنڈر نما منظر آتا ہے، اور دھندلا ہو جاتا ہے۔ اور میل خور چھپکلی دیدوں میں پھنس جاتی ہے۔

▬ ▬

ذکاءالدین شایاں

حمید سہروردی کے افسانوں کا فن

ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت کے رجحان کی بنیادوں پر جو افسانے تخلیق کیے گئے، ان میں افسانے کی مرکزی ہیئت یعنی بیان، زبان، کردار، واقعات، کہانی اور انسانی افعال کے تمام عناصر کو شعریت زدہ نثر میں ڈھالنے اور بیانیہ کے روایتی حدود کو توڑنے کا ایسا رواج پڑا کہ اب افسانہ اپنی زمین کا خود مخالف ہونے لگا۔ ترقی پسندی نے افسانے کے بیانیہ "میڈیم" سے اپنے عہد کے جیتے جاگتے کرداروں اور واقعات کی پیچیدگیوں میں گتھی ہوئی کہانی اور اشخاصِ قصہ کی زبان سے اپنی تحریک میں جو مدد لی، وہ افسانے کا زریں زمانہ تھا۔ کیونکہ ترقی پسندوں کے سامنے بھی اگرچہ افسانے کی کہانی، یا کردار و واقعات اور ماحول و زندگی کو حقیقی سرزمین سے تعلق رکھتی تھی لیکن فن کے اعتبار سے ان میں بیانیہ کا کچھ نہ کچھ تمثیلی اور علامتی انداز ضرور شامل تھا جس کے ذریعہ یہ لوگ اپنے افسانوں میں اشخاص، کردار اور زندگی کا وہ سچا نقشہ پیش کرتے تھے جو تخیلی سطح پر فن کا نمونہ بھی ہوتا تھا۔ ہم ان افسانوں میں اپنے عہد یا اپنی تاریخ کے دھندلے مناظر کو روشن ہوتا ہوا دیکھتے تھے۔ کرداروں کی زبان بھی ان کے طبقاتی ماحول کی آئینہ دار ہوتی تھی۔ پلاٹ کے تانے بانے میں بھی تجسس اور دھندلکے رنگ واضح

رہتے تھے ۔۔۔ لیکن جدیدیت کے افسانے نے اس فنی طریقہ کار کو "اینٹی افسانے" کے نام پر بالکل بدل دیا۔ اب ہمارا افسانہ اپنے عہد یا اپنے مابعد کی تاریخی سرگوشیوں اپنے موجودہ "وجود" کے لمحاتی محسوسات کے بل بوتے پر خود کلامی (اور کہیں کہیں ہذیان گوئی) اور شعری اسلوب کی علامتی تہہ دار یوں کے ترتیب انداز بیان اور کہانی کے ارتقائی تقاضوں اور کرداروں کی واقعاتی زبان سے الگ تمثیل، تخئیل اور علامتی فضا میں اس طرح سامنے آیا کہ "افسانے" کی اپنی پہچان گم ہو گئی۔ افسانے کی صنف کے دوسرے حریف یعنی انشائیہ، لطیف نثر، شاعرانہ زبان وطریق، داخلی خود کلامی، کہانی اور بیانیہ کے بے ترتیب اور ناہموار استعمال اردو افسانے کا وہ امتیاز بن گیا جو جدیدیت سے منسلک ہونے لگا۔ حمید سہروردی کے افسانوی مجموعہ "ریت ریت لفظ" میں یہی انداز جھلکتا ہے۔ اساطیر، تلمیح، علامت، تمثیل، شعری اسلوب وغیرہ ان افسانوں کی بنیادی خصوصیات ہیں جو قاری کے ذہن کو اگرچہ وقت، زمانہ، تاریخ، سماجی، سیاسی اور مذہبی طنز اور زندگی کے دیگر حقیقی رُخ کی طرف لے تو جاتی ہیں مگر اس افسانے کا قاری شاعری سے بھرپور زبان کی چاشنی اور اس کے ماحول میں اتنا گُم ہو جاتا ہے کہ وہ "افسانے" کی اصلیت سے برائے نام آگاہ ہو پاتا ہے۔

حمید سہروردی کے افسانوں جیسے "ہوا" "مورتی" "وحشت ہُو کی صدائیں"، "محشر"، "ندی اور وہ" "بابا" اور "لاطائل" وغیرہ میں افسانہ نگار کے اس ذہن سے تعارف حاصل کرتے ہیں جو شاعری کی زبان کے ذریعہ علامتوں، تمثیلوں، کنایوں اور تلمیحوں کے جادو جگا کر ہمیں بڑی حد تک اپنے موجودہ سماج کی خباثتوں اور خرابیوں، بدعنوانیوں اور "وجود" کی بے ہئیتی کا احساس تو دلاتا ہے لیکن اصلاً ان افسانوں میں شاعری کے رموز ہمیں بار بار "شعر" جیسی تخئیلی دنیا میں لے جاتے ہیں

جہاں محسوسات اور وجدان ہی کا ہشت پہلو کھیل ہوتا ہے۔ جہاں وقت کا لمحہ پھیل کر صدیوں میں ڈھل جاتا ہے اور ہم اپنے موجودہ اور تاریخی وقت کے جبر میں گرفتار ہوکر بھی اپنی "سرزمین" سے کچھ اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں۔

حمید سہروردی کے افسانوں کی زبان شاعری سے اتنی قریب ہے کہ اس پر افسانے کے بجائے انشائیے کا دھوکا ہوتا ہے۔ اور جو کردار اور اشخاص ہم سے ملتے ہیں وہ صرف سائے کی طرح آکر اپنا کام انجام دیتے ہیں اور چھپ جاتے ہیں۔ استعارہ، تمثیل اور علامت کا یہ زور حمید سہروردی کے افسانوں کی خصوصیت ہے جو اُن کے افسانوں کو شاعری کی وہی نکھری نکھری زبان عطا کرتی ہے جو پرتوں کی طرح کھُل کھُل کر اپنے معانی کا احساس دلاتی ہے۔ اور شاعری ہی کی طرح بلیغ اور دور رس اور ششش پہلو ہے۔ جس میں زندگی کا تفکر اور فلسفہ ہے، سماجی نشتر بھی ہیں۔ نفسیات اور جنس کے حقائق بھی ہیں:

—— "ہوا" کا منظر نامہ دیکھیے۔

موم بتی کا جلنا - فنا - بقا - موم بتی کے دو مختلف روپ - منفی، مثبت - ماچس - آگ جلنا - پگھلنا - ڈھلی زنجیر وغیرہ

—— "مورتی" کا ماحول دیکھیے۔

تاریخ کا باب - نجات دہندہ - نروان - حرفِ بے مطلب - درخت - گرگٹ کے رنگ - گھائل کبوتر - اندھی مورتی - مورتی کو صاف کرنا - مورتی پر دھول جمنا وغیرہ

—— "دشتِ ہوا کی صدائیں" اپنے شاعرانہ عمل میں یہ فضا پیدا کرتا ہے۔ ماقبل تاریخ - عفریت - کھنڈر - ذہن کے اندر راہ ڈھونڈنا - ازل - ابد - مخلوق -

— "محشر" کا افسانہ درج ذیل تمثیل کا عکس ہے جو نثریت کا بھی حامل ہے۔

ہنستا ہوا بندر، روتی ہوئی فاختہ، کانپتی ہوئی بلی، ڈولتا ہوا سانپ" ڈنک اٹھائے۔ بچھو۔

— "ندی اور وہ" کا افسانہ بھی یہی اسلوب پیش کرتا ہے جو استعاروں کی بنیاد ہے

ندی مسلسل بہہ رہی ہے۔ سمندر تڑخ رہا ہے۔ ندی۔ سمندر۔ تالاب۔

— "بابا" میں "وجود" کی تفسیر ملتی ہے۔

انگیٹھی ٹوٹ گئی۔ زبان۔ خواب۔ کہاں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ لکیریں۔ نجات دہندہ۔ ٹپ ٹپ۔ کھٹ کھٹ۔ وقت کی لہریں۔

— "لاطائل" میں علامتوں کا شاعرانہ ڈھنگ ملتا ہے جو وراثت کی حقداریوں کا مظہر ہے

روشنی۔ پارہ، چھوٹا بھائی، بڑا بھائی وغیرہ

حمید سہروردی کے افسانوں میں عموماً یہی شعری زبان کارفرما ہے، جو ان کے افسانوں کو جدیدیت کا پابند بناتی ہے اور جو قاری کے ذہن میں یہ شبہ پیدا کر دیتی ہے کہ افسانے کی صنف اور انشائیے یا ادبِ لطیف کی صنف میں فرق کہاں ہے؟؟

— —

چند عمدہ ناولیں

معصومہ	عصمت چغتائی	۳۵ روپے
ندی	عبداللہ حسین	۹ روپے
ضبط کی دیوار	سلیم اختر	۹ روپے
موراں والی	ہرنام داس صحرائی	۱۵ روپے
بے جڑ کے پودے	سہیل عظیم آبادی	۱۲ روپے
چراغِ تہہ داماں	اقبال متین	۱۵ روپے
غبارِ شب	قاضی عبدالستار	۳۰ روپے
چار چہرے	سہیل عظیم آبادی	۱۵ روپے
طوفانِ حوادث	پروین سرور	۱۰ روپے
ایک محبت کی کہانی	غازی صلاح الدین	۱۰ روپے
آدھا راستہ	کرشن چندر	۲۵ روپے
تنکے کا سہارا	شکیلہ اختر	۳۰ روپے
بیگانہ	البرٹ کامو	۲۰ روپے
طوفانِ حوادث	پروین سرور	۱۰ روپے

نصرت پبلشرز - امین آباد لکھنؤ-۲۲۶۰۱۸

حمید سہروردی نے افسانہ نگاری میں جو مقام اپنے لیے بنایا ہے وہ خالصتاً ان کے فنی ریاض کی دین ہے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ گروہ بندی کی وجہ سے اچھی سی اچھی آواز غیر موثر بنائی جا رہی ہے، حمید سہروردی کو اس پر بجا طور پر فخر و اطمینان ہونا چاہیے۔ شہرت حاصل کرنے کا دوسرا گر اپنے آپکو زیادہ سے زیادہ گنجلک اور مبہم بنا لینا ہے تاکہ فکر و فلسفہ کے اس مقام پر اپنے آپ کو فائز کرایا جا سکے جہاں سے ہر اختلافی آواز اٹھانے والا حقیر کیڑا نظر آئے۔ حمید سہروردی نے ایسا کوئی گر استعمال نہیں کیا ہے۔

حمید سہروردی کا اسلوب گزشتہ تین دہائیوں میں اپنائے جانے والے علامتی اور رمزیاتی رنگ سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے ہوئے اس اعتبار سے الگ پہچانا جاتا ہے کہ آج کے فرد کے باطن اور خارج میں چھڑی ہوئی جنگ کو انھوں نے ایک حقیقت کے طور پر جبراً تسلیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ اپنے گہرے سماجی شعور اور تاریخ کے ادراک کی مدد سے اس صورت حال کو سمجھا اور اس کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کی دنیا اور کائنات کی پراسراریت، اس میں رچے بسے انتھاہ کرب اور فرد کے غیر یقینی مقدر کو بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں، لیکن اس سے اپنے پڑھنے والے کے اندر مایوسی اور بددلی پھیلا کر زندگی سے بیزاری کا درس دینے کا کام نہیں لیتے۔ مجھے ان کی افسانہ نگاری کا یہی نکتہ سب سے اہم محسوس ہوا ہے۔ کیونکہ ان کے ساتھ لکھنے والوں کی بڑی تعداد ایسے افسانے لکھ رہی ہے جس سے زندگی سے فرار اور خودکشی کرنے کی طرف رغبت دلانے کا گمان ہوتا ہے۔ حمید سہروردی کے افسانے اس کے برعکس پڑھنے والے کو زندگی سے آمیزش اور زندگی میں زہر پھیلانے والے عوامل اور عناصر سے آویزش کی طرف لے جاتے ہیں۔

ریت ریت لفظ کے بعد کے افسانوں میں حمید سہروردی کا سماجی شعور زیادہ گہرا اور زیادہ بیدار ہوا ہے اور انھوں نے ادراکِ حقیقت کے لیے اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ خلوص کے ساتھ وقف کیا ہے۔ ان افسانوں کے یکجا شائع ہونے سے ہمیں آٹھویں اور نویں دہائی کی افسانہ نگاری میں ایک اہم موڑ کی شناخت میں یقیناً مدد ملے گی

عتیق احمد۔ کراچی